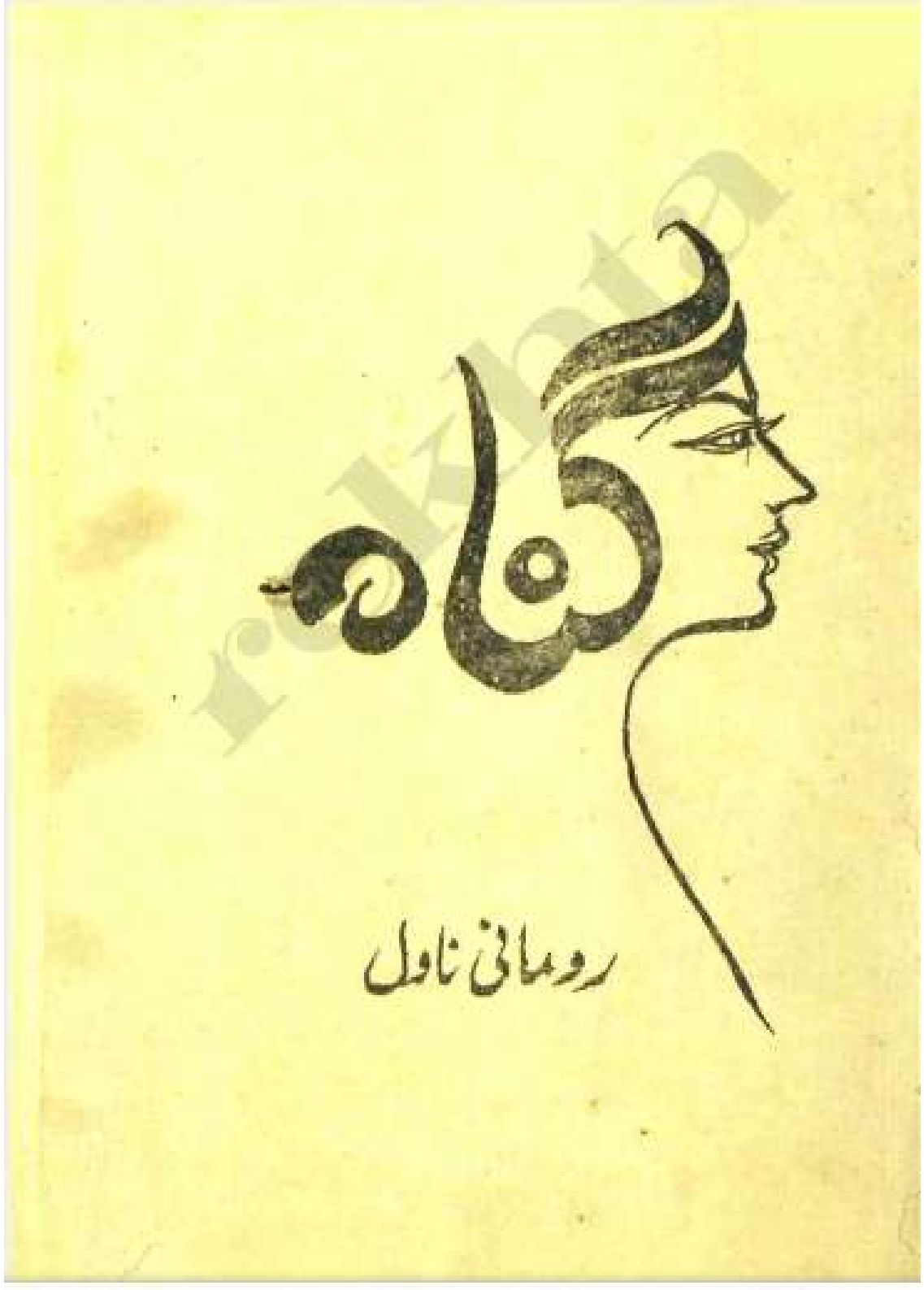
گناہ
رومانی ناول

سرگزشت

رئیس احمد جعفری

قیمت ——— پانچ روپے پچاس پیسے
مطبوعہ ——— الہ آباد پریس دہلی

ناشر
نیو ادبی دنیا پبلشرز دہلی ۶

rekhta

انتساب

محبت ایک جذبۂ بے اختیار ہے جو دلوں میں دبے پاؤں داخل ہوتی ہے اور زندگی میں حشر برپا کر دیتی ہے۔ لیکن زندگی کی ٹھوس ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جن کو جنسی تقاضے کہہ لیجئے یا محبت برائے زندگی کا نام دے لیجئے۔ محبت اور بوالہوسی کے درمیان ایسے ہی لاتعداد مرحلے ملیں گے۔ کہیں اولاد و جانشین کی خواہش اور کہیں جنسی تقاضوں کی تسکین کا مقصد۔ اس کتاب میں محبت ایک جذبۂ بے اختیار بھی ہے۔ محبت جنسی تقاضہ بھی ہے۔ اور محبت ضرورت زندگی بھی اور ان تمام صورتوں کی آویزش نے ایک نہائت دلچسپ۔ دلکش اور سبق آموز ماحول تیار کر دیا ہے ـــ

اس لئے میں گناہ کو ان حسین روحوں سے منسوب کرتا ہوں جو

محبت برائے محبت اور ـــ

محبت برائے زندگی

کے رموز سے واقف نہیں ۔

رات خوفناک حد تک تاریک تھی ۔ اتنی تاریک ـــ جیسے کسی مجرم کا ضمیر! پورا آسمان کالے بادلوں کی اوٹ میں چھپ چکا تھا۔ چار سو ایک گمبھیر اندھیرا مسلط تھا۔ ہوا کے تند جھکڑ درختوں میں سے گزرتے ہوئے مہیب آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ بارش زور پکڑتی جا رہی تھی اور ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ مل کر فضائیں اور دہشت پھیلا رہی تھی۔ پھر ایک زوردار گرج پیدا ہوئی جیسے بہت سی توپیں ایک ساتھ سر کی گئی ہوں۔ گھونسلوں میں چھپے ہوئے پرندے ڈر کر عجیب و غریب آوازیں پیدا کرنے لگے جیسے ان پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔

بجلی چمکی ـــ چند ساعتوں کیلئے فضائیں روشنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی

ہر جگہ پانی کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ جن میں بارش کے قطرے گرتے ۔۔ بلبلے پیدا ہوتے۔ اور پھر سے پانی میں مل جاتے۔ درختوں سے گرے ہوئے پتے بیل بے پناہ بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح بے دست و پا بہہ رہے تھے۔

شڑاپ ۔۔ شڑاپ کی آواز نزدیک ہوتی گئی۔ اندھیرے میں ایک بار پھر سے کھلبلی مچ گئی۔ اور بجلی کی چمک نے تھوڑی دیر کیلئے اندھیرے پر غلبہ پا لیا۔

ایک انسانی سایہ اس طوفان سے بے خبر بڑھتا آرہا تھا۔ اس نے اپنے گرد چیتھڑا اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ کالروں میں چھپا ہوا تھا۔ سر پیٹ بھیگ جانے کی وجہ سے نیچے کی جانب جھک گیا تھا۔ ٹخنوں تک پتلون پانی میں شرابور تھی۔ جوتوں کے اندر پانی داخل ہو کر چلتے وقت عجیب سی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔

اب وہ پانی سے نکل کر ایک چٹان پر کھڑا ہو گیا۔ جس کے نیچے دریا پوری تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اور اس کی موجیں چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں ۔۔ شاید وہ اسے اپنے اندر مدغم کرنا چاہتی تھیں ۔۔ ہوا کی تیزی نے لہروں کو خطرناک بنا دیا تھا۔ اور ان میں بڑھتے وقت ایک خوفناک آواز پیدا ہوتی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک ان باغی لہروں کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے خوف کے آثار نمایاں تھے۔ اس کا رنگ بدل چکا تھا۔ اور آنکھیں بے جان معلوم ہو رہی تھیں۔ دل پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی چھاتی کو پھاڑ کر باہر ابل پڑے گا۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔ اس کا تمام جسم کا[illegible] اٹھا

خوف سے لب ہلے۔ لیکن آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ اس کے ہونٹ اور گلا خشک ہو چکے تھے۔ اسے وہ چٹان جس پر وہ کھڑا تھا گھومتی معلوم ہونے لگی اس نے جلدی سے سر سے ہیٹ اتار کر آسمان کی جانب منہ اٹھا کر بوندوں سے خشک گلے کو تر کرنے کی کوشش کی۔

بجلی نے ایک بار پھر تمام فضا کو چند لمحات کے لئے اندھیرے کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ انسانی سائے کی پژمردہ آنکھیں تیز روشنی کی تاب نہ لاسکیں اور پلکوں نے جھک کر پتلیوں کو اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ چہرے پر خوف و ہراس نے پوری طرح قبضہ جما لیا تھا۔ ماتھے پر رنج و غم کی سلوٹوں سے جھریوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ بے جان آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ جو اس کے پچکے ہوئے رخساروں کو داغدار کئے ہوئے تھے۔ سر کے بال بھی بہت دنوں تک تراشے نہ جانے کی وجہ سے گردن کو ڈھانپے ہوئے تھے۔

وہ پھٹی نگاہوں سے دریا کی سرکش لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ جو چٹان سے ٹکرا کر ایک مہیب آواز پیدا کرتی بڑی شان سے لوٹ جاتی تھیں۔ اور پھر پورے جوش سے اس پر حملہ کرتی تھیں۔ ان میں اسے اپنے اندر مدغم کرنے کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر چٹان اپنی جگہ پر ویسے ہی جمی ہوئی تھی۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اسے کپکپانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے جلدی سے ہیٹ سر پر رکھ لی۔ اور بھیگے ہوئے چسٹر کو ٹھیک کرنے لگا۔ بالوں سے گرتے ہوئے، پانی کے قطرے گردن سے ہوتے ہوئے کالر کو تر کرتے جسم پر پھیل رہے تھے اس نے ایک جھرجھری لی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے بہت سے کانٹے اس کے جسم میں پیوست ہو گئے ہوں۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر گردن کو خشک کیا۔ اور ہیٹ کو اوپر اٹھا کر بالوں کو بھی رومال

سے خشک کیا اور پھر سے ہیبت چھن کر ایک لمبی سی سانس لی جیسے اب اس کے ارادوں کو کوئی ترک کرنے والا نہ ہو۔

بارش اور تیزی سے برسنے لگی۔ جیسے آج ہی برس کر وہ ہمیشہ کیلئے برسنا بھول جائے گی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کیلئے بہت بے قرار نظر آتی تھی قطرے دھار کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ہوا بھی اپنی تیزی دکھلانے پر تلی ہوئی تھی چاروں طرف خوفناک شور تھا۔ دریا کے کشادہ سینے میں اور زیادہ جوش پیدا ہو چکا تھا۔ اور اس کی بے تاب لہریں اور تیزی سے کناروں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ کناروں کا پانی اپنے ساتھ گھاس پھونس اور پتے لئے دریا کے پانی کو اور زیادہ گدلا کر رہا تھا۔

بادل بہت زور سے گرجا۔ پھر ایک دھماکا ہوا۔ انسانی سایہ سر سے پاؤں تک کانپا۔ اس نے ڈری ڈری نظروں سے چاروں طرف دیکھا جیسے موت کا فرشتہ ہاتھوں میں گرز لئے وحشت ناک، غضبناک اور چنگھاڑتا ہوا اس کی جانب بڑھ رہا ہو۔ اور تھوڑی دیر میں اس کا بھاری بھرکم گرز اس کے سر پر پڑنے والا ہو پھر اسے محسوس ہونے لگا۔ جیسے اس کا تمام جسم بری طرح پس گیا ہو۔ اس کتے کی مانند جسے اس نے سڑک پر تڑپتے دیکھا تھا جو ایک ٹرک کے نیچے ہو کر بالکل پچک کر رہ گیا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا بڑھ گیا خوف سے وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ وہ چلانا چاہتا تھا۔ لیکن آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے آیا تھا۔ لیکن اب اسے موت سے ڈر معلوم ہونے لگا تھا اس کے دل میں ایک آواز پیدا ہوئی اور تمام جسم میں زہر کی مانند سرایت کر گئی پھر آسمان پر روشنی کی ایک لہر دوڑ گئی چند قدم کے فاصلے پر ایک تناور درخت

زمین پر دیوہیکل ہاتھی کی مانند پڑا تھا۔ وہ اپنی بزدلی پر مسکرا پڑا۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

"مجھے اپنے ارادوں میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر بزدلی آڑے آ جائے۔ اور مجھے یہاں سے ناکام لوٹنا پڑے۔"

یہ آواز اس کی پہلی آواز کے خلاف بغاوت تھی۔ جس نے اسے وہاں سے بھاگ چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس کے پاؤں ڈر کی وجہ سے بوجھل ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

اب اس نے اپنے آپ کو ان تند لہروں کے حوالے کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا جو اسے اپنی آغوش میں لینے کے لئے پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ ایک ارادہ ایک خواہش ایک عزم اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے چٹان کے آخری سرے پر پہنچ کر حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ جیسے وہ مرنے سے پہلے اس تمام کائنات کو جی بھر کر دیکھ لینا چاہتا ہو اور اپنی زندگی کی آخری خواہش پوری کر رہا ہو۔ اس کا دل ساکن تھا۔ گھبراہٹ کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ اب وہ موت سے پوری طرح ہم آغوش ہونے کو تیار تھا۔ اس کے چہرے پر سلوٹوں اور غم کے اثرات کے بجائے ایک چمک سی پیدا ہو چکی تھی۔ جیسے مرجھائے ہوئے پھولوں پر شبنم کے چند قطروں کی وجہ سے ایک بار پھر سے تازگی کے آثار پیدا ہونے لگیں۔

وہ یکبارگی ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن پھر سے تیز ہو گئی۔ اسے سانس رکتی معلوم ہونے لگی۔ وہ حیرت سے قریب کی ایک چٹان کی طرف جو اس سے چند قدم کے فاصلہ پر تھی، دیکھنے لگا۔ ایک انسانی سایہ جلدی جلدی دریا کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک چادر سے لپیٹ رکھا تھا۔

اب وہ سب کچھ بھول گیا۔ کہ وہ بھی خودکشی کے ارادے سے یہاں آیا ہے اس کا ذہن خالی ہو چکا تھا۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر دوسرے سائے کو دیکھنے لگا۔ جو چٹان کے آخری سرے پر پہنچ کر دریا میں بڑھتے ہوئے طوفان کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے آسمان کی جانب دیکھا۔ اور آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پانی کی آغوش میں پناہ دینا چاہا۔

"ٹھہرو۔ ٹھہرو"

پہلا سایہ زور سے چلایا۔

اس نے محسوس کیا کہ سردی نے اس کے گلے کو اپنی زد سے محفوظ نہیں رہنے دیا۔ اور اس کی آواز خلاف معمول بہت زیادہ مدھم تھی۔ اب وہ تیزی سے پکارتا ہوا اس چٹان کی طرف دوڑنے لگا۔ دوسرے سائے نے شاید اس کی آواز سن لی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ گھوم کر اس کی جانب دیکھا۔ اور پھر جلدی سے چھلانگ لگانے کے ارادے سے پیچھے ہٹا۔ اس سے پیشتر کہ وہ اپنے آپ کو لہروں کے حوالے کر دیتا۔ پہلے سائے نے اسے جلدی سے روکا۔

"خودکشی کرنا گناہ ہے"

اس نے اس کو چادر سے پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی یہ نصیحت محض خود فریبی ہے۔ حالانکہ اس کا اپنا ارادہ بھی خودکشی کرنے کا وہ اس پراسرار مقام پر آیا ہی اسی لئے تھا۔

بادل اتنے زور سے گرج کہ ان کے دل دہل گئے۔ اب وہ بالکل خاموش تھے ہوا بہت تند ہو چکی تھی۔ اور سردی کی شدت میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ اب وہ بری طرح کانپ رہے تھے۔

"چلو سامنے ملاحوں کے جھونپڑے میں پناہ لیں"

پہلے سائے نے کہا۔

لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے سردی تیروں کی مانند اس کے جسم کو چھلنی کئے جا رہی تھی۔ وہ جواب کا انتظار کیے بغیر دوسرے سائے کو کھینچتا ہوا جھونپڑے میں لے گیا۔ جھونپڑا بالکل ویران تھا شاید وہ لوگ سردیوں کی ایسی راتوں میں گھر چلے جاتے ہوں۔

جھونپڑے کے اندر کی گھٹی گھٹی فضا میں سردی کسی حد تک کم محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن پھر بھی کبھی ہوا کے آوارہ جھونکے ان کا پیچھا کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح اندر آ ہی جاتے تھے۔ چھت کئی جگہوں سے ٹپک رہی تھی۔ انہوں نے ایک کونے میں پناہ لی۔ جہاں پر جگہ خشک تھی۔

چھت پر گرتی ہوئی بوندوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ دریا اور بارش کا ملا جلا شور وہاں تک بھی پہنچ رہا تھا۔ پھر بھی اندر کی فضا میں خاموشی کا دخل تھا وہ دونوں اس طرح بیٹھے تھے۔ جیسے وہ ایک دوسرے سے کوئی واسطہ نہ رکھتے ہوں۔

"ہاں۔ دوست یہ تو کہو۔ کہ تم اپنی جان کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑے ہو"

پہلے سائے نے اندھیرے میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ شاید اس نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہو پہلے سائے نے تھوڑی دیر تک جواب کا انتظار کیا۔

"میرے نادان دوست تم نے کوئی جواب نہیں دیا — میرا خیال ہے تمہیں ضرور محبت میں ناکامی ہوئی ہے۔ جو اس طرح اپنی جان پر کھیل جانے کی ہمت کی"

پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اندھیرے میں چھت کی جانب دیکھنے لگا
وہ ایک مرتبہ کھانسا اور گلے کو ہاتھ سے سہلانے لگا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا
تھا جیسے گلے میں خراشیں آ چکی ہوں۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔

" یہ محبت بھی بڑی ظالم چیز ہے، یہ لفظ ویسے کتنا پیارا ہے کتنا لطیف
ہے۔ جسے ادا کرتے وقت زبان ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتی ہے۔ لیکن
میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ زہریلی کوئی چیز نہیں۔ اس سے زیادہ خطرناک
کوئی چیز نہیں۔ یہ آنکھوں سے ہوتی ہوئی دل و دماغ پر اپنا قبضہ جما لیتی ہے۔ اور
انسان اس کے زیر اثر سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر اس کے چکر میں پھنس کر میری
اور تمہاری طرح موت کی خوفناک گود میں سکون ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔
موت ــــ محبت ــــ محبت ــــ موت لیکن اسے پھر بھی سکون
میسر نہیں ہوتا۔

وہ چپ ہو گیا۔ " تو یہاں بھی چھت ٹپکنے لگی۔ وہ بڑبڑایا۔ اور وہاں
سے ہٹ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔

" دوست میں بھی تمہاری طرح خودکشی کرنے آیا تھا۔ پہلے تو
بزدلی نے میرے راستے میں روڑے اٹکائے۔ اور جب میں نے بزدلی
کو زیر کر لیا۔ تو میری نظر تم پر پڑی۔ اور میں نے تمہیں بچانے کا مصمم ارادہ کر لیا
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہمیں زندہ رہنا چاہیے۔ تم میرے لئے فرشتہ بن کر آئے
اور میں تمہارے لئے ــــ ہم دونوں بچ گئے ــــ لیکن دوست تم تو کچھ
بولتے ہی نہیں ــــ کیا زبان بندی کی قسم کھا رکھی ہے ــــ تو میں تمہیں
اپنی محبت کی داستان سناتا ہوں۔ جس نے مجھے خودکشی کرنے پر مجبور
کیا۔ لیکن تمہیں بھی اپنی داستان کہنا ہوگی۔ شاید دلوں کی داستان

کہنے سے من کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔

وہ کھانسنے لگا۔ اسے اپنی آواز کچھ جچی جچی سی محسوس ہو رہی تھی
اس نے ایک بار کھنکار کر گلا صاف کر کے اپنی داستان کا آغاز
کیا۔

موسم بہار کی ایک خوشگوار شام تھی۔ لطیف ہوا کے خنک جھونکے دل و دماغ کو ان کیفیتوں سے دوچار کر رہے تھے۔ جنہیں سرورِ ابدی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ میں گھر کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھا فضا کی لطافتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سورج اپنا دامن سمیٹ کر مغرب کی وادیوں میں پناہ ڈھونڈنے کے لیے جا چکا تھا۔ تمام فضا پر ہلکا ہلکا اندھیرا مسلط تھا۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ گہرے نیلے آسمان پر سفید بادلوں کا کوئی ٹکڑا تیرتا ہوا نظر آ جاتا تھا۔ دور فضا میں کچھ تھکے ہارے پرندے بے دلی سے ہوا کے دوش پر سرگرم سفر تھے۔

گھر کے صحن میں ہرے ہرے پودوں پر رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک کیاری میں لالہ کے پھول یوں دکھلائی دے رہے تھے جیسے ہرے رنگ کی مخمل پر سلگتے ہوئے انگارے بکھیر دیئے گئے ہوں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے جب انھیں جنبش ہوتی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ انگارے چشم زدن میں چار سو ایک آگ سی لگا دیں گے۔

میں کافی دیر تک اس خوبصورت نظارے سے دل بہلاتا رہا۔ پھر ہوا کے ایک خنک جھونکے نے مجھے آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کر دیا۔ میں کرسی کا سہارا لے کر نہ جانے کن خیالات میں ڈوب گیا۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن مجھے روشنی کی ہلکی ہلکی سی ایک [illegible] نظر آ رہی تھی۔ میں محسوس کرنے لگا تھا جیسے کھلے آسمان کی فضا میں اڑتا جا رہا ہوں۔

ایک آواز پر میں چونک پڑا۔ گھر کے سامنے تانگہ رکنے کی آواز سنائی دی۔ میرے دل میں ایک خیال ابھرا۔ میں جلدی سے باہر آ گیا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ تانگے میں بیٹھی تھی۔ میں اسے تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی ماں کی موجودگی کے احساس نے مجھے شرمندہ سا کر دیا۔ اور میں گھر کے اندر چلا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھ سے کوئی چیز چھین گئی ہو۔ میرا دل بار بار مجھے باہر جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں کب تک اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ جب دوبارہ باہر نکلا تو وہ تانگے میں اکیلی ہی تھی۔ اب مجھے روکنے والا کوئی نہیں تھا میں اسے جی بھر کر دیکھتا رہا۔ وہ تھوڑی دیر تک نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی رہی لیکن جب اسے میری موجودگی کا احساس ہوا۔ تو وہ بھی کبھی کبھی نظریں چرا کر مجھے دیکھ ہی لیتی تھی۔ اس کی ایک نظر سے میرا دل بے تاب ہو جاتا تھا۔ اور اتنی زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ جیسے اس کے بعد پھر دھڑکنے کا موقع نہ ملنا ہو۔

میرا یہ حسین خواب بہت جلد ٹوٹ گیا۔ سامنے کے گھر سے اس کی ماں نکلی وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی مجھے یوں معلوم ہوا جیسے اس کی ماں کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی ہوں۔ اور میں شرمندگی کے احساس سے یونہی

باہر کی جانب چلنے لگا۔ میرا دل اب تک دھڑک رہا تھا۔ تانگے کی آواز جوں جوں نزدیک ہو رہی تھی۔ دل اور زیادہ تیزی دکھلانے پر تلا ہوا تھا جب تانگہ نزدیک پہنچا تو میں نے سہمی ہوئی نظروں سے ادھر دیکھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر اکیلی ہی تھی۔ اس کی ماں اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ بے خیالی میں میرا ہاتھ ماتھے کی جانب اٹھ گیا۔ میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اپنے خوبصورت پنکھڑیوں کے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر کر میرے سلام کا خیر مقدم کیا۔ مسرت کی اس کیفیت میں کھو کر میں یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ تانگہ کدھر کو گھوم گیا۔ اب میری آنکھوں کے سامنے لمبی اور ٹیڑھی تارکول کی سڑک تھی جو سرمئی اندھیرے میں کالے سانپ کی مانند دکھلائی دے رہی تھی۔ جس نے اس "جانِ آرزو" کو اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف اداسی ہی اداسی تھی۔ میری آنکھیں اسے ایک بار دیکھنے کی تمنا میں جھپکنا بھول چکی تھیں۔ میرے کان اس کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی ایک ہلکی سی آواز سننے کیلئے بے تاب تھے۔ میرا دماغ ابھی تک اس کے شگفتہ چہرے کے دلآویز خدوخال میں کھویا ہوا تھا اور دل کی بے قراری ہزارہا قیامتوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے تھی۔ غرض میرے حواس کو ایک عجیب قسم کی کیفیت سے سامنا آپڑا تھا۔

اندھیرا مکمل طور پر اپنا قبضہ جما چکا تھا۔ گہرے کالے آسمان پر چمکتے ہوئے تارے پلکوں پر ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کی مانند معلوم ہو رہے تھے۔ آسمان سے لے کر زمین تک تمام فضا اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ میری رگ رگ میں اس کی ایک ایک ادا تحلیل ہو چکی تھی۔ اس کی مسکراہٹ زہر بن کر میرے جسم میں سرایت کر چکی تھی۔ میں سب کچھ سوچنا بھول چکا تھا۔ میرے دل میں ایک عجیب قسم کی کسک

چٹکیاں سی لے رہی تھی۔

میں اپنے آپ کو ایک اجنبی تصور کر رہا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ اسی بے خیالی کے عالم میں مال روڈ پر آ گیا۔ جہاں زندگی رنگین تھی۔ مگر اس رنگینی پر ایک عجیب قسم کے تصنع کا گمان گزرتا تھا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں عجیب چہل پہل تھی۔ میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ چائے کے کیف اور کھوکھلے قہقہوں میں کھو جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ زندگی کے غموں کو کچھ دیر کیلئے بھول جانے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھے۔

ہوٹلوں سے باہر کھڑی ہوئی کاروں میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور اونگھ رہے تھے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے ذہنوں میں اپنے آقاؤں کی مصروفیت کے دھندلے دھندلے خاکے بنانے میں لگے ہوں۔ ہوٹلوں کے اندرونی ماحول کو اپنے تخیل کی آنکھ سے دیکھنے میں مصروف ہوں۔

سڑک پر چلنے والوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ چند نوجوان جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خراماں خراماں ٹہل رہے تھے۔ چند آوارہ منش چھوکرے ان کے تعاقب میں بن ٹھن کر چل رہے تھے۔ اور ان کی محبت بھری زندگی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چند ادھیڑ عمر کے اور رسیدہ بوڑھے بھی تھے جو اپنی جوانی کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھر رہے تھے۔ جب کبھی کسی نوجوان جوڑے کو قریب سے گزرتے دیکھتے تھے تو حریصانہ نظروں سے ان کا تعاقب کرتے کرتے رک جاتے تھے کہیں کہیں یورپین جوڑا بھی نظر آ جاتا تھا۔ عورت کے جسم پر برائے نام لباس اس کے تمام اعضاء کو نمایاں کئے ہوئے تھا۔ اور قریب سے گزرنے والے نگاہوں ہی نگاہوں میں اس کے گورے گورے گداز جسم کی تمام لطافتوں کا جائزہ لے کر اپنی "محرومی" کو سینے سے لگائے گزر جاتے!

میں اس شور و شغب سے بے نیاز اپنی ہی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ طبیعت پر ایک بوجھ اور دل میں کسک سی تھی۔ میں کئی مرتبہ لوگوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ میں اس ماحول سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ اس لئے تیز قدموں سے چلنے لگا۔ لیکن میرے خیالات ایک ہی جگہ پر مرکوز تھے۔ میری آنکھیں اب تک اس کی متلاشی تھیں۔ میرے کان اس کی آہٹ سننے کے لئے بے قرار تھے۔

اب میں بازار سے بہت دور نکل چکا تھا۔ جہاں سڑک بالکل سنسان تھی۔ کبھی کبھی کوئی کار اس پر سکون ماحول میں بے ہنگم سا ارتعاش کرتے گزر جاتی تھی۔ سڑک کے کنارے کی کوٹھیوں میں بھی مکمل سکوت تھا۔ دو رویہ لگے ہوئے درخت بھی بالکل خاموش تھے۔ جیسے سکوت سے مزار پر گڑے ہوئے کتبے ہوں۔

میری سانس پھول چکی تھی۔ اس لئے میں آہستہ چلنے لگا۔ لیکن دل کی بے قراری اور تیز ہو رہی تھی۔ دل و دماغ میں ایک ہلچل سی پیدا ہو چکی تھی۔ جیسے آتش فشاں پہاڑ کی تہہ میں لاوا ابل رہا ہو۔

آسمان پر روپہلی سی چاندنی پھیلنے لگی تھی۔ دو درختوں کے جھنڈ میں سے چاند طلوع ہو رہا تھا جس کی مدھم مدھم سی روشنی نے اندھیرے میں ایک جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ درختوں میں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی عجیب سماں دکھا رہی تھی۔ میں ایک درخت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس بڑھتے ہوئے نور کا استقبال کرنے لگا۔ جوں جوں چاند اونچا ہو رہا تھا۔ آسمان پر چمکنے والے مدھم ستارے نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔ اور تیز ستارے ماند پڑ رہے تھے۔

میری نظریں چاند کے نور افشاں چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا سیاہ داغ کافی نمایاں ہو چکا تھا اور جو اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔ "عورت چرخہ کات رہی ہے" بچپن میں ہم چاند کے اس داغ کو ان الفاظ سے تشبیہ دیا کرتے

تھے۔ عورت خواہ چرخہ کاتے یا باغ میں سیر کرے۔ وہ عورت ہی ہے۔ جسے دیکھ کر ہر شخص ایک درد، ایک کسک، ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ اور اس کے دل میں محبت کا ایک داغ جگہ حاصل کر لیتا ہے۔

ان خیالات کے ساتھ ساتھ اس کی یاد پھر سے ابھرنے لگی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے چاروں طرف تمام فضا حتیٰ کہ چاند میں بھی اس کی صورت نظر آ رہی تھی۔ میں بہت بے چین ہو چکا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ اسے کہاں تلاش کروں۔ مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ وہ کون ہے۔ کہاں رہتی ہے۔" جوں جوں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اسی قدر میرے دل و دماغ پر اس کا قبضہ بڑھتا جاتا تھا۔ اور میں اس نیرنگئ احوال پر حیران ہو رہا تھا۔

میں بالکل تھک چکا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ایک قدم بھی چل سکوں۔ میں بالکل بے بس تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ شاید کوئی تانگہ مل جائے۔ لیکن مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے آسمان کی جانب دیکھا۔ جہاں ٹمٹماتے ہوئے ستارے میری بے بسی پر مسکرا رہے تھے۔

میرے جسم میں توانائی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میری بجھی بجھی آنکھوں میں امید کی چمک پیدا ہو گئی۔ دل میں محبت کا جوش پھر سے ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ باہیں پھیلائے میری جانب بڑھ رہی ہو۔ اور مجھے محبت کی دولت سے مالا مال کر رہی ہو۔

اب میری ٹانگوں میں تھکن نام کو بھی نہیں تھی۔ اور میں اپنے آپ کو بالکل تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک جذبے نے میری تمام تھکاوٹ کو دور کر دیا تھا۔

جیسے وہ کوئی پیار بھرا گیت الاپ رہا ہو۔ جیسے دل کو وہی آواز بھلی معلوم ہوتی ہے جس میں محبت کا اثر ہو۔ اور وہ الفاظ دل کی گہرائیوں میں اتر کر اثر انداز ہوتے ہیں۔ محبت ایک معجزہ ہے۔ محبت ایک سحر ہے، جو سراب بھی ہے اور آبِ حیات بھی۔

"مجھے میری محبت پکار رہی ہے"

یہ الفاظ خود بخود میرے ہونٹوں سے نکل گئے۔

میں جلدی جلدی گھر کی جانب چلنے لگا۔ میرے قدم پہلے سے زیادہ تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ کھمبوں پر لگے ہوئے بجلی کے بلب بھی کتنے ہو رہے سے معلوم ہو رہے تھے۔ دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ لیکن ان میں روشنی بدستور ہو رہی تھی یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کہکشاں پر چل رہا ہوں۔ میری رہگذر زمین پر نہیں آسمان پر ہے۔!

کہیں کہیں کوئی انسانی شکل دکھائی دیتی تھی۔ ایک دو جگہ پولیس کے گشتی دستوں سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ وہ مجھے اس عجلت میں دیکھ کر رکے۔ لیکن میں اپنی دھن میں بڑھتا گیا۔ کبھی کوئی آوارہ کتا سڑک کے کنارے سے بیدار ہو کر بھونک کر میرا استقبال کرتا۔ اور پھر اپنی جگہ پر سر کو زمین پر ٹیک کر اونگھنے لگتا تھا۔

میں گھر کے سامنے جا کر رک گیا۔ میں اب اسی جگہ کھڑا تھا جہاں میں نے اسے دیکھا تھا ایک مرتبہ تخیل کی تخیل میں اسے اسی طرح بیٹھے دیکھا۔ پھر میری نظریں سامنے والے گھر کے دروازے پر جم گئیں۔ جہاں سے میں نے اس کی ماں کو نکلتے دیکھا تھا۔ اور میں اسی امید پر وہاں سے چلا تھا۔ کہ ان کے ذریعہ سے اس کا پتہ چل سکے گا۔

"لیکن؟"

میرے دماغ میں ایک سوال پیدا ہوا۔

کسی شخص سے بات نہیں کی تھی۔ اور اب مجھے اپنی اس عادت پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ البتہ ان کے ناموں سے ضرور واقف تھا۔

"اب کچھ کرنا ہی ہوگا"

میں نے اپنے آپ سے کہا۔

بہت سوچ بچار کے بعد ایک راستہ نظر آیا۔ "منو" سے ملنے والوں کا بچہ جو اکثر ہمارے ہاں آتا رہتا ہے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے"

میں نے گھنٹی بجائی اور ان کے بند دروازے کو دیکھتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

"اتنی دیر کہاں رہے بیٹا"

امی کی آواز سنائی دی۔

"ایک دوست کے ہاں چلا گیا تھا۔"

میں نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"اتنی رات گئے گھر سے باہر رہنا ٹھیک نہیں"

امی کی آواز دوسرے کمرہ میں سے سنائی دی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور پلنگ پر لیٹ کر چپ چاپ اس کے تصورات کی ایک حسین وجمیل دنیا میں کھو گیا، جہاں زندگی ہی زندگی تھی حسن ہی حسن تھا —— ایک بہار بداماں زندگی، ایک زندگی آموز حسن!

خنک ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے جو اکثر میرے لئے طمانیت قلب کا باعث بنے تھے۔ اس وقت مجھے ان سے بھی ڈر معلوم ہونے لگا تھا۔ جیسے وہ بھی تیز تیز مجھ سے دور ترتے جا رہے ہوں۔ کھلے آسمان کی پہنائیوں میں چمکنے والے ستارے نہ جانے کیوں اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ ایک تو طویل اور ختم نہ ہونے والی رات اور پھر یہ چمکتے ہوئے تارے۔ میری حالت اس شخص کی سی ہو رہی تھی کہ جسے عالم یاس میں دن کے وقت میں ستارے نظر آنے ہوں!

میں کروٹیں بدلتے بدلتے تھک چکا تھا۔ مجھے اپنے تمام اعضا میں ایک ہیجان درد سا محسوس ہو رہا تھا۔ اور آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ مگر میں جاگ رہا تھا۔

دور سے کسی مرغ کی آواز سنائی دی۔ میں چونک پڑا اور اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ میں غور سے ادھر ادھر دیکھا۔ کان لگا کر آواز سننے کی کوشش کی۔

"صبح ہو چکی ہے لیکن لوگ سو رہے ہیں"

میں سوچنے لگا۔

میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مشرق کی طرف افق پر چھائے ہوئے اندھیرے کی تہہ کی رنگت بدل رہی تھی۔ اور پھر موذن کی آواز سنائی دی۔ میرا دل ایک خاص جذبے کے تحت زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور میں مشرق کی جانب پھیلتے ہوئے اجالے کو دیکھنے لگا۔

صبح ہو چلی تھی۔ چڑیاں درختوں پر چہچہاتی ہوئی شور مچا رہی تھیں۔ دودھ بیچنے والوں کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ میں جلدی سے نیچے آ گیا اور سامنے والے گھر کے بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد بے قرار ہو کر میں اندر

rekhta

میں بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ لیکن نیند نہ جانے کہاں چھپی ہوئی تھی میں صبح کے انتظار میں ایک ایک پل گن گن کر کاٹ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وقت کی رفتار تھم سی گئی ہو۔ جیسے کسی نامعلوم قوت نے وقت کے آوارہ دیوتا کو پابجولاں کر دیا ہو کہنے کو رات چاندنی تھی مگر اس چاندنی کے پس پردہ گمبھیر اندھیرے کارفرما معلوم ہوتے تھے۔ جو لحظہ بہ لحظہ میری بے کلی کو بڑھاتے جا رہے تھے۔

چاروں طرف مکمل سکوت تھا۔ میں اپنے آپ کو کسی اجاڑ بیابان میں محسوس کر رہا تھا۔ جہاں ہمیشہ موت کی سی خاموشی چھائی رہتی ہو۔ کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز اس سکوت میں ہلچل سی مچا دیتی تھی۔ اور پھر وہ آواز تھوڑی دیر تک کانوں میں گونجتی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اس آواز سے نفرت ہو چکی تھی۔ مجھے اس وقت اپنی قوت سماعت پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ کاش یہ بہرا ہو جاتا اور مجھے یہ آواز کے سننے کی طاقت مجھ میں نہ ہوتی رہا!

"منو کا بچہ آج نہ جانے کہاں مر گیا؟"

میں بڑبڑایا۔ مجھے منو پر غصہ آنے لگا۔

"کیا بات ہے بیٹا۔ آج تم کچھ اداس اداس ہو؟"

امی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں امی۔"

میں نے بے زاری کے لہجے میں جواب دیا۔

میری نظریں بار بار باہر کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ شاید وہ پھر سے نظر آ جائے۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ کبھی گھر کے اندر کبھی باہر۔ کہیں پر بھی ایک منٹ کیلئے چین نہیں پڑ رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ میں نے اسے دیکھا ہے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں نے ایک سہانا خواب دیکھا ہو۔ میں اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے گھر سے باہر آ گیا اور ٹانگوں کے پہیوں کے نشان غور سے دیکھنے لگا اب مجھے کچھ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میں نے اسے ضرور دیکھا ہے۔ اور یہ اس کے ٹانگے کے پہیوں کے نشان ہیں جس میں کہ وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر وہ منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا میں اندر آ کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ امی سے منو کے بارے میں پوچھنا چاہا۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو گیا۔ آخر جب رہا نہ گیا تو میں نے ہمت سے کام لے کر کہا۔

امی ۔۔۔۔۔!"

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور مجھ میں کچھ پوچھنے کی ہمت نہ رہی۔

"کیا ہے۔؟"

انہوں نے پوچھا۔ ان کی آواز میں کتنی ہمدردی تھی!

"وہ منو کئی دنوں سے نہیں دیکھا۔ کیا وہ لوگ کہیں چلے گئے ہیں؟"

آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔ لڑکھڑاتی ہوئی زبان نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مطلب ادا کر ہی دیا۔

"نہیں تو وہ کل ہی یہاں آیا تھا۔ تم اس سے باتیں کرتے رہے تھے۔"

"ہاں ہاں۔ مجھے یاد آ گیا۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آج منو کو پوچھ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

"یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ آج صبح سے اسے دیکھا نہیں تھا۔ میں سمجھا شاید۔"

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ اسکول گیا ہوگا۔ دوپہر تک آ جائے گا۔"

امی کی آواز مجھے کمرے میں سنائی دی۔

میں بستر پر لیٹ گیا۔ اور کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک صفحہ پر رک کر چند الفاظ پڑھے۔ لیکن دل اچاٹ تھا۔ پھر کتاب کو بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس کے دھوئیں میں کھو کر سب کچھ بھول جانے کی کوشش کی۔ لیکن دھوئیں میں بھی اس کی شکل سامنے نظر آ رہی تھی میں نے سگریٹ پھینک دیا۔ اور کھڑکی میں جا کھڑا ہو گیا۔

صحن میں ایک پرانا برگد کسی اختپوچی کی مانند اونگھتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی لمبی لمبی شاخیں بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے بالوں کی مانند معلوم ہو رہی تھیں۔ شاخوں پر نکلے ہوئے نئے پتے بڑے خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ پتے ابھی بہت چھوٹے اور رنگ سبزی مائل تھا۔ زمین پر سوکھے پتے ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ اور ہوا کے رحم و کرم پر ایک بے ہنگم سا رقص کر رہے تھے

کی نیرنگیاں اسے بے ہنگم سی گردش میں گم کر دیتی ہیں۔!!

"منو اسکول سے آگیا ہے اور میں نے اسے بلا بھیجا ہے۔"

امی نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔

میں چپ چاپ لیٹا رہا کیونکہ امی پر اپنی بے قراری ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے کان منو کے قدموں کی چاپ سننے کے لئے بے چین تھے۔ اور پھر وہ اچانک۔ بھاگتا ہوا میرے قریب آکر رک گیا۔ اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میرے قلب کی حرکت رک چکی ہے میں تھوڑی دیر تک یوں ہی لیٹا رہا۔ اور وہ مجھے بدستور تکتا رہا۔ جیسے وہ میرے اس طوفان سے واقف ہو جو میرے سینے میں موجزن تھا۔

"کیا ہو رہا ہے — منو میاں"

میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اسکول سے آیا ہوں۔ آپ نے بلایا تھا۔ چلا آیا ہوں"

"تم بہت اچھے ہو — منو"

"لیکن ماسٹر جی تو مجھے ہر روز مارتے ہیں"

اس نے بجھے ہوئے لہجے سے کہا۔ تو میں [illegible] مسکرا پڑا۔ اور اس کے منہ پر ہلکی سی چپت لگا کر بولا۔

"تمہارا ماسٹر بالکل گدھا ہے۔ بہت برا ہے وہ۔ خیر ہم [illegible] گے اور وہ تمہیں نہیں مارے گا"

منو کے چہرے پر [illegible] مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بڑی احسان مندانہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"چلو [illegible] چلیں"

میں نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں باہر آگئے۔ منو نے میری انگلی تھام رکھی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ بازار کی جانب چل پڑے۔ میرا دل بار بار منو سے اس "آفت جان" کا پتہ دریافت کرنے کیلئے مچل رہا تھا جس نے پچھلے کئی گھنٹوں سے میرا چین میرا قرار چھین لیا تھا بہت سے الفاظ میرے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے۔ لیکن میں اس وقت کے انتظار میں تھا جب انہیں ہونٹوں پر لا سکوں گا۔

منو بڑے مزے سے میرے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ کبھی وہ سڑک کے کنارے کے درختوں کے اوپر کچھ دیکھنے لگتا تھا۔ اور کبھی کسی راہگیر کا نگاہوں سے تعاقب کرتا تھا۔

بازار میں آکر میں سوچنے لگا تھا کہ کہاں چلا جائے۔ منو منہ اٹھائے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہا ہو کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

"چلو منو آج تمہیں کچھ کھلائیں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی ---"

"رئیس سے پالا پڑا تھا"

منو نے بات مکمل کر دی۔ اور لپک لپک کر میرے ساتھ چلنے لگا۔

ہم قریب ہی ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ دو چار آدمیوں کے سوا تمام کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ بیرا آگیا۔ میں نے تمام ہوٹل کا جائزہ لیکر منو سے پوچھا جو اسوقت چھت کے پنکھے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"چائے بھی پیو گے"؟ — "جی ہاں"۔ منو نے جواب دیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ تمہیں چائے نہیں پینی چاہئے۔ ابھی بچے ہو" اور پھر بیرے سے مخاطب ہو کر "میرے لئے چائے اور ان کے لئے کھانے کی بہت سی چیزیں"

بیرا چلا گیا۔ منو مسکرا رہا تھا۔ اور میں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔

چائے آگئی۔ اور ایک پیٹ میں منو کے لئے کھانے کی چیزیں۔ منو انھیں دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں بہت بھوک لگی ہے"

میں نے اس کی جانب پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے کھانا کھا لیا تھا"

"کھانا تو کھا لیا تھا۔ لیکن یہ تمام چیزیں تو نہیں کھائیں"

"ہاں۔ ہاں کھائی تھیں"

اس نے اکڑتے ہوئے کہا۔

"کب"

کئی بار۔ جب بھی ہمارے یہاں مہمان آتے ہیں۔ ہم یہ تمام چیزیں خوب کھاتے ہیں"

وہ اب تک للچائی ہوئی نظروں سے پلیٹ کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"کل کھائی تھیں کیا؟"

"کل تو کوئی مہمان ہی نہیں آیا"

"کل شام جو ایک عورت آئی تھی۔ بوڑھیا سی۔ جس کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ لیکن وہ تو اندر ہی نہیں گئی۔ وہ باہر تانگے میں بیٹھی رہی تھی۔ لیکن بڑھیا تو اندر گئی تھی۔ وہ کون تھی۔ کہاں رہتے ہیں وہ لوگ۔؟"

میں یہ تمام باتیں جلدی سے کہہ گیا۔ اور منو کے جواب کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

"کل تو کوئی مہمان نہیں آیا۔ ورنہ ہم یہ تمام چیزیں ضرور کھاتے"

مجھے منو پر غصہ آنے لگا۔ اور اپنے آپ پر رحم۔ میں نے چائے کا

پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں نے پگھلتا ہوا سیسہ حلق اندھیل لیا ہو۔ میری آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

میں چائے اسی طرح چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور منو کا ہاتھ پکڑ کر ہوٹل سے باہر آگیا۔ اس کی نظریں اب تک پلیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم گھر جاؤ منو"

میں نے اسے گھر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

وہ حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی جانب چل پڑا اس کی نظروں سے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ دل ہی دل میں مجھے کوس رہا ہو۔ میں بلاوجہ ادھر ادھر گھومتا رہا۔ لیکن کسی کل بھی چین نہیں پڑتا تھا۔ میں گھر آکر اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں اسے اتنا نزدیک محسوس کر رہا تھا جس طرح میں اپنے آپ سے۔

ہوا کے جھکڑ اپنی پوری شدت سے سرگرداں تھے۔ سردی بھی اپنا زور دکھلا رہی تھی۔ وہ پرانی ہوئی تھی جھونپڑی کی کچی دیواروں سے مٹی نیچے گر رہی تھی۔ اور پھر بارش کا پانی اسے اپنے ساتھ بہانے لئے جا رہا تھا۔ چھت کا چھپر کچھ ایسے طریقے سے ٹپکنے لگا تھا کہ اس کے ایک ایک تنکے سے بوندیں رس کر آ رہی تھیں۔ جھونپڑے کا کچا فرش گیلا ہو کر کیچڑ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

وہ دونوں بھیگ جانے کی وجہ سے بری طرح کانپ رہے تھے۔ بعض مرتبہ اس خوفناک شور میں ان کے دانت بجنے بھی سنائی دیتے تھے۔ ہوا کی شائیں شائیں سے دل پر خوف طاری ہو رہا تھا۔ آسمان کا رنگ اور گہرا ہو چکا تھا بارش کا زور بدستور تھا۔ البتہ بادل کی خوفناک گرج میں کسی حد تک کمی آ چکی تھی دریا کی موجیں پوری تندی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان کی بے قراری میں نہ جانے کیا راز تھا۔ جو اس قدر بپھری ہوئی تھیں۔

انہوں نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کو اپنے جسم کے گرد اور زیادہ لپیٹنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کپڑے بھیگنے کی وجہ سے ان کے جسم کی حرارت کو بھی اندر روکنے کے لئے بے سود ثابت ہو رہے تھے۔ لیکن پھر بھی سرد اور تند ہوا سے کسی حد تک انہیں بچائے ہوئے تھے۔

جھونپڑے کی اندرونی فضا لحہ بہ لحہ کچھ بدلتی معلوم ہو رہی تھی۔ اور اب بھی سردی کے آگے بے اختیار دانتی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر بھی وہ ان کی مدد کے لئے پوری کوشش کر رہی تھی۔ جبکہ وہ بھی نہ جانے اپنا راگ بھول کر کہاں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

بچپلے ساٹھے نے کھانس کر گلا صاف کیا۔ اس نے اندھیرے میں ایک بار جھونپڑے کی چھت کا جائزہ لیا۔ پھر سر سے ہیٹ اتار کر اس پر پڑی ہوئی بوندوں کو جھٹک کر جلدی سے سر پر رکھ لیا۔

"نہ جانے یہ طوفان کب رکے گا"

اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہ بتا سکا اور میں اس کی یاد میں اس سے اور زیادہ نزدیک ہو گیا۔ اور وہ میری نظروں سے اوجھل نہ جانے کہاں چھپی ہوئی تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ اور میں اسے بھلا دینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ جب میں کوئی بات سوچنا چاہتا تھا، تو نہ جانے وہ کہاں سے دماغ کی ایک ایک نس سے ابھر پڑتی تھی۔ اور میں اس کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

میں نے اسے تلاش کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ سارا سارا دن سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے گزر جاتا تھا۔ وہ بھی تھکا دیتے مرے نزدیک تک نہیں

چھلکتی تھی۔ میں ہر راہ چلتی لڑکی کو غور سے دیکھتا۔ بعض مرتبہ تو مجھے اس قسم کے منظروں سے نوازا جاتا تھا۔ کہ جن کے سننے سے مجھے شرم محسوس ہوتی تھی۔ لیکن میرے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی۔ اور میں دل کے ہاتھوں کچھ اس طرح مجبور ہو چکا تھا کہ کئی مرتبہ مجھے وہ نظر آتی تھی۔ اور میں کافی دور تک اس کا پیچھا کرتا اور قریب پہنچکر مجھے شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ کوئی اور لڑکی ہوتی تھی۔ اور مجھے دل پر اس قدر غصہ آتا تھا کہ اسے جسم سے نکال کر بھاری بھر کم بسوں، موٹروں کے نیچے پسنے کیلئے ڈال دوں۔ لیکن یہ میرے لئے کسی حال میں بھی ممکن نہیں تھا۔

ایک شام میں نے اسے دیکھ ہی لیا۔ وہ ایک ٹانگے میں جا رہی تھی۔ اس وقت نزدیک کوئی اور ٹانگہ بھی نہ تھا۔ کہ جس میں بیٹھ کر میں اس کا پیچھا کرتا۔ اس لئے مجبوراً میں نے بہت تیز چلنے کی کوشش کی۔ لیکن میں اسے نہ پا سکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری کشتی کنارے سے ٹکرا کر پھر سے طوفانوں کے حوالے ہو چکی ہو۔ میں نے منزل کو پا لیا تھا۔ لیکن منزل مجھ سے دور ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں کے قریب سے میری محبت گزر گئی۔ اور میں اسے جی بھر کر بھی نہ دیکھ سکا۔ میرا چین و قرار، میری راتوں کی نیند، میرے خیالوں کا مرکز، میرے دل و دماغ کا سرمایہ تھوڑی دیر پیشتر میرے سامنے تھا۔ لیکن میں اس سے اپنا سب کچھ مانگ نہ سکا۔ مجھے اپنی قسمت کی بے چارگی، اپنی زندگی کی بے بسی، اپنے خیالات کی تلخی پر رحم سا آنے لگا!!!

جب میں گھر پہنچا تو بہت تھک چکا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ سورج بھی دن بھر کی مسافت کے بعد آرام کے لئے جا چکا تھا۔ تمام فضا اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ میں بستر پر لیٹ کر پھر اس کے خیالات میں ڈوب گیا۔ میں نیند سے دست و گریباں تھا۔ لیکن وہ نہ جانے کیوں مجھ سے پہلو بچانا چاہتی تھی۔

اب میں نے اس کی تلاش کا ارادہ دل سے نکال دیا۔ میں سارا سارا دن گھر میں پڑا رہتا تھا۔ کسی کام کو دل نہیں چاہتا تھا۔ سگریٹ کے علاوہ میرا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ نہ جانے دن بھر کتنے سگریٹ پھونکتا اور پھر ان کے زہریلے دھوئیں میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ امی کئی بار اس پریشانی کی وجہ دریافت کر چکی تھیں۔ لیکن میں نے انھیں ہر بار ٹال دیا۔ وہ میری گرتی ہوئی صحت کے بارے میں پریشان تھیں۔ نہ جانے اس کے خیال نے مجھ پر اتنا اثر کیوں کیا تھا۔

ایک روز ایک واقف میرے پاس آیا۔ وہ میری حالت پر کچھ اس طرح مسکرایا کہ مجھے اس پر غصہ آ گیا۔ اس سے پیشتر کہ میں اس پر اپنے غصہ کا اظہار کرتا وہ مسکرا کر بولا۔

" دوست عشق کسی کو بدمزاج نہیں بناتا۔ بلکہ اس میں صبر کا مادہ پیدا کرتا ہے "

میں اس کی اس بات پر بہت سٹپٹایا۔ کیونکہ آج تک میں نے کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔

" آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں "

میں نے چیں بجبیں ہو کر پوچھا۔

" کچھ نہیں، میں تو آپ کی عیادت کے لئے آ گیا تھا "

وہ پھر مسکرایا۔

" عیادت ــــ کس کی عیادت "

" جناب کی "

" آخر یہ کیا بکواس ہے۔ میں بیمار تھوڑی ہی ہوں۔

میں نے ذرا اور تلخ لہجے میں کہا۔

"عشق سب سے خطرناک مرض ہے"

وہ حسب معمول مسکرا کر بولا۔

"برائے کرم آپ یہاں سے چلے جائیں"

"اگر نہ جاؤں ــــ تو؟"

"لیکن آپ بار بار عشق کا قصہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے کسی سے عشق نہیں"

میں نے باہر کی جانب دیکھتے ہوئے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔

"لیکن وہ تو ۔۔۔۔۔"

"وہ کون؟"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

"ایک لڑکی۔ بڑی خوبصورت لڑکی۔ بڑی بھولی بھالی لڑکی۔ گورا گورا رنگ لمبا سرو سا قد۔ خوبصورت آنکھیں۔۔۔۔۔"

"کون ہے وہ؟"

میں نے بڑی بے قراری سے پوچھا۔

"ہوگی کوئی میں کیا جانوں"

"خدارا کچھ کہو۔ میری قسم۔ تمہیں خدا کی قسم"

"ایک تھی لڑکی، ایک تھا لڑکا۔ لڑکی تھی تانگے پر اور لڑکا تھا پیدل"

اس نے مجھے میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔ میری آنکھوں میں عجب چمک پیدا ہوئی۔ میرا دل ایک بار زور سے دھڑکا میری نظروں میں اس کی نیچی نگاہیں گھوم گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے وہ بلا رہی ہو۔ میں نے بہت بے قراری سے پوچھا۔

"وہ کہاں رہتی ہے"

"بھلا میں کیا جانوں" اس کے لہجے کا انداز عیارانہ تھا۔

"تم نہیں جانتے تو اور کون جانتا ہے۔ مجھے جلدی بتاؤ۔ میں اس کے لئے بہت بے قرار ہوں"

"لیکن آپ کو تو کسی سے عشق نہیں ہے۔ پھر اتنی بے چینی کیونکر" اس نے ہنس کر کہا۔

"خدارا مذاق چھوڑ دو۔ اور مجھے جلدی بتاؤ کہ وہ کہاں ہے"

میں نے اس کی منت و سماجت کرتے ہوئے پوچھا۔

"آج شام ہمارے گھر چلے آنا وہ لڑکی تمہیں وہاں ملے گی"

"سچ"

وہ چلا گیا۔ میرا دل خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ میرا گلا بھر آیا تھا۔ میں اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔ مجھے جس کا بہت افسوس رہا۔

میں شام کے انتظار میں بہت بے قرار تھا۔ میرے دل میں کئی قسم کے خیالات آ رہے تھے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ "اس نے مجھے اپنے گھر کیوں بلایا ہے۔ مجھ سے دھوکا نہ کیا جا رہا ہو کہیں یہ جھوٹ ہی تو نہیں"

ان تمام خیالات کے باوجود میں نے اس کے ہاں جانے کا فیصلہ کر لیا اور میں شام کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ ایک ایک لمحہ گن گن کر گذارنے لگا۔ میں شام سے بہت پہلے گھر سے نکل پڑا۔ اور مختلف سڑکوں کے چکر کاٹتا کئی بار ان کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ لیکن شام ہونے میں نہیں آتی میں بار بار آسمان کی جانب دیکھتا جہاں سورج کی تمازت اپنے شباب پر تھی

میں نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ جس کی سوئیاں اپنی رفتار بھول چکی تھیں۔

آخر کار وہ لمحہ بھی آگیا۔ سورج مغرب کی پہاڑیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اور میں ایک جگہ رک کر اس کے ڈوبنے کا منظر دیکھنے لگا۔ افق پر پھیلی ہوئی سرخی سے معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس دن اس نے اپنی منزل کو پا لیا ہو۔ اور خوشی سے اس کے چہرے کی لالی اور زیادہ پھیل گئی ہو۔ اور پھر اندھیرا چھانے لگا۔ جو میرے لئے خوشیوں کا پیغام لے کر آرہا تھا۔ میں نے بڑھتے ہوئے سایوں کو خوش آمدید کہنے کیلئے مسرت بھری آنکھوں سے پھیلے ہوئے آسمان کو دیکھا۔ اور دل میں بڑھتے ہوئے طوفان کو لیکر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس گھر کی جانب چل پڑا۔ جہاں میرے تصورات کی حقیقت، میرے لئے چشم براہ سراپا انتظار تھی۔

اب میں اپنی منزل کے سامنے کھڑا تھا۔ میری آنکھوں بار پھر سے تانگے کا منظر آگیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ مکان بھی ایک تانگے کی مانند ہو۔ اور جس میں میرے خیالوں کی پری میرا انتظار کر رہی ہو۔

مکان کا دروازہ بند تھا۔ میں ٹکٹکی باندھے نہ جانے کیوں اسے گھور رہا تھا۔ پھر آگے بڑھا۔ آواز لگا۔ آواز لگانے کے لئے ذہن میں خیال ابھرا لیکن دماغ میں چکر کھانے کے بعد نہ جانے کس گوشے میں جا چھپا۔ میرا حلق خشک ہو چکا تھا میں نے کھانسنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ دل پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ ٹانگوں میں کپکپی محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے مکان گھومتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

میں نے دروازہ تھپتھپانے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا زنجیر کو تھام کر میں نے بکھرے ہوئے حواس کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اور بہت سے

قدموں کی آواز نزدیک آتی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ وقت میرے لئے بہت صبر آزما تھا میں نے وہاں سے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ لیکن میری ٹانگیں میرے خیالات کا ساتھ نہ دے سکیں۔ پسینے کے چند قطرے ماتھے پر چمکنے لگے ہونٹ خشک ہو کر ان پر پپڑیاں جم چکی تھیں۔ اندھیرے میں بہت سے رنگ برنگے نشانات چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں ایک حسین خواب دیکھ رہا ہوں۔ خیالوں کی دیوی حسین تمناؤں کے گہوارے میں مجھے جھولا جھلا رہی ہے۔ میں بڑے غور سے دروازہ کھولنے والی کو دیکھ رہا تھا۔ جو مجھے جھکی جھکی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پنکھڑیوں سے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ شرمائی ہوئی لجائی ہوئی دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ میری نظروں کے سامنے میرے خیالوں کی دیوی تھی۔ میرے ارمانوں کی دنیا۔ میرے دل کی دھڑکن اور میری تمناؤں کا مرکز۔

اس نے ایک بار نظریں اٹھائیں۔ اور مسکرا کر مجھے کچھ اس طرح دیکھا کہ میری محبت کی کلی چٹک کر پھول بن گئی خوشیوں کے دھارے پھوٹ پڑے۔ میں بہت مسرور تھا۔ میرے دل کی دھڑکن آہستہ آہستہ اپنے معمول پر آچکی تھی۔ میری آنکھیں میں نہ زندگی کی چمک تھی۔

اس نے اشارے سے اندر چلنے کو کہا۔ میں چپ چاپ اندر جا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ اور خراماں خراماں اندر آگئی۔ مکان بالکل خالی تھا۔ میں ابھی تک اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے قریب سے گزر کر سامنے پلنگ پر بیٹھ گئی میں نے ایک بار مکان کا جائزہ لیا۔ وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ خالی تھا۔

میں ابھی تک کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ جس میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔ کمرے کی چیزوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک پلنگ جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ دو کرسیاں۔ لکھنے کی میز جس پر چند کتابیں بڑے سلیقے سے چنی گئی تھیں۔ ایک کونے میں تپائی پر ریڈیو سیٹ پڑا تھا۔ جسے ایک کڑھے ہوئے رومال سے ڈھانپا ہوا تھا۔ انگیٹھی پر دو فریم شدہ تصویریں پڑی تھیں۔ جو شاید کسی انگریزی رسالے سے پھاڑی گئی تھیں۔ کھڑکیوں میں ہلکے نیلے رنگ کے پردے تھے۔

میری نظریں تمام چیزوں سے ہوتی ہوئی اس پر آ کر رک گئیں۔ وہ اب تک مسکرا رہی تھی۔ اور میں اس کی مسکراہٹ میں اس قدر کھو چکا تھا کہ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا بالکل اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے چند قطرے چمکنے لگے۔ اور ہونٹ [illegible]

ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں ڈر اور گھبراہٹ کے ملے جلے اثرات نمایاں تھے۔

"تشریف رکھیے"

وہ بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کر سکی۔

میں اس کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب وہ سامنے کی دیوار پر گھور رہی تھی اس کے چہرے پر کئی قسم کے رنگ آ جا رہے تھے۔ اس کے سینے کے اتار چڑھاؤ سے اس کے دل کی دھڑکن کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ جو اپنی پوری رفتار سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کبھی کبھی مجھے ٹیڑھی نظروں سے بھی دیکھ لیتی تھی۔

مجھے اپنی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا کہ میں نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں نہ جانے کس جذبے کے تحت صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ چکا تھا۔ میں دل ہی دل میں بہت پشیمان تھا۔ اور بدستور اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ اس کی جھجک جو تھوڑی دیر پیشتر اس کے چہرے پر عیاں تھی اب وہ بہت حد تک دور ہو چکی تھی۔ اور اس کی نظریں دیوار سے ہوتی ہوئی میرے چہرے پر آ کر رک گئیں اور میں نے اس کی آنکھوں میں بہت سے محبت کے افسانے کہانیاں پڑھیں۔ اور وہ نہ جانے میرے چہرے میں کیا کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ اب ہم اپنے دل کے ساتھ دوسرے کے دل کی آواز بھی سن سکتے تھے۔ اور خاموش نظروں کی زبانی نہ جانے کیا کچھ کہہ گئے تھے۔

"کتنا اچھا چاند ہے آج کی رات"

میں نے خاموشی کا سلسلہ توڑتے ہوئے کھڑکی سے باہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

rekhta
rekhta

"ہوں"

وہ مسکرائی۔

"اور آپ کے ہونٹوں کا تبسم"

میں نے منہ اس کے ہونٹوں کے قریب لے جا کر کہا۔

وہ شرما سی گئی۔ اور انگلی سے چادر پر کچھ لکھنے لگی۔ میں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"کتنا پیارا ہاتھ ہے اور کس قدر ملائم"

میں نے بڑے پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔

اس نے ہونٹ اوپر کی جانب لے جا کر ناک سکیڑ لی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ تم نے یہ کون سی انوکھی بات کہہ دی۔ یہ عام باتیں ہیں۔ نہ جانے لوگ کیوں ہاتھ کی اس قدر تعریف کرتے ہیں۔

"کاش یہ ہاتھ ہمیشہ یونہی ہاتھ میں رہے۔ اور میں اسے اسی طرح سہلاتا، چومتا، اور آنکھوں سے لگاتا رہوں۔"

میں نے اس کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ میں چونک پڑا جیسے اس نے میرے منہ پر ایک زناٹے کا طمانچہ دے مارا ہو۔

وہ بالکل خاموش تھی۔ لیکن میری ہر بات کا جواب چہرے کے اتار چڑھاؤ سے دے رہی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے باتیں کرے۔ پیار اور محبت کی باتیں۔ راز و نیاز کی باتیں۔ اور اتنی باتیں کرے کہ میں ان میں کھو کر اپنا آپ بھول جاؤں اور ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاؤں۔ جہاں چار سو زندگی ہی زندگی ہو!

[illegible]

اپنا رخسار اس کے خوبصورت رخسار سے ملا دیا۔ وہ ٹیڑھی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے جا رہی تھی۔ پھر میں نے اپنا بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیا۔ اس کے بالوں سے آنے والی بھینی بھینی خوشبو نے میرے دماغ پر ایک نہ بھول جانے والا اثر چھوڑا۔ اس دوران میں میں نے اس کے دل کی دھڑکن کو بھی محسوس کیا جس میں چھپا ہوا طوفان کروٹیں بدلتا معلوم ہو رہا تھا۔ اور پھر ایک ایسا ہی طوفان مجھے اپنے سینے میں بھی موجزن معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک محسوس کی، ایک نشہ سا محسوس کیا۔ ان میں نیلے سے...... رنگ کے ڈورے ابھر آئے تھے۔ جن کی وجہ سے اس میں مستی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

اس کا چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ چہرے کا رنگ بدلا بدلا سا تھا۔ اور اس پر حیا کی سرخی دوڑ چکی تھی۔ میرے لئے یہ وقت بہت بے تابی کا تھا۔ جیسے انسان خلا میں پرواز کرتا رہ جائے۔ اور اسے نہ تو آسمان پر پہنچنے کی امید ہی ہو۔ اور نہ ہی زمین پر آنے کی آس۔

میرا وہ ہاتھ جو اس کے گلے میں تھا۔ کچھ ڈھیلا محسوس ہونے لگا میں نے آہستہ سے اس کو اپنی جانب کھینچا۔ وہ خود بخود میری جانب کھنچتی گئی جیسے اسے محض ایک اشارے کی ضرورت ہو۔ اس کے سر کے بال کھلے تھے۔ پھر میرے کپکپاتے ہونٹوں پر اس کے گرم گرم ہونٹ تھے۔ اور بالوں نے سامنے سے ہمارے اس راز کو چھپا رکھا تھا۔ بالوں کی بھینی بھینی خوشبو اور اس کے ہونٹوں کے لمس سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میرے جسم پر دہکتے ہوئے کوئلے رکھ دیئے ہوں۔

دل کی دھڑکن زور پکڑ چکی تھی۔ سانس تیزی اختیار کر چکی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ اور سینے پوری رفتار سے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ کافی دیر تک

[illegible]

خواہش کے مطابق وہ اپنے ہونٹوں کی شراب پلاتی رہی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ مجھے ہمیشہ اسی طرح مدہوش رکھے۔ اور میں اسی طرح بن پئے پر کیف نشے میں جھومتا رہوں۔ اور وہ نشہ دائمی ہو۔

پھر اس نے اپنے ہونٹوں کو ہٹا لیا۔ میں چونک سا پڑا۔ جیسے کسی پیاسے سے پانی کا پیالہ چھین لیا جائے۔

اب وہ اپنے ملائم اور خوبصورت رخسار میرے چہرے پر رگڑ رہی تھی میں اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر محسوس کیا۔ جہاں محبت کے سوا کچھ نہ ہو۔ چاروں طرف محبت کے مدھر گیت الاپے جا رہے ہوں۔ اور پیار کا رواج ہو۔

وہ ایک دم چونک پڑی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے گردن کے ایک ہلکے سے جھٹکے سے بالوں کو پچھلی جانب ڈال دیا۔ اور ہاتھوں سے ٹھیک کرتے ہوئے خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میں نے محسوس کیا جیسے مجھے آسمان سے اس فرش خاکی پر پھینک دیا گیا ہو۔ میں اب تک اس کی خوفزدہ نظروں کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہوں"

وہ ایک دفعہ مجھے دیکھ کر باہر دیکھنے لگی۔

"آخر اس پریشانی کی وجہ"

میں نے الجھتے ہوئے پوچھا

"وہ لوگ آ رہے ہوں گے"

"وہ کون؟"

"اس گھر والے"

"پھر میں تمہیں کہاں ملا کروں گا؟"

میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہیں پر"

شاید وہ میری اس پریشانی کو بھانپ گئی تھی۔

"لیکن"

"آپ اس بات کا قطعاً فکر نہ کریں۔ یہ میری سہیلی کا گھر ہے۔ میرے اور اس کے علاوہ باقی تمام لوگ اسوقت سیر کیلئے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے میں اس وقت یہاں ہوتی ہوں۔ اور آپ جب چاہیں یہاں آ سکتے ہیں۔ لیکن اسوقت"

"آپ کی سہیلی کہاں ہے؟"

میں نے کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس کمرے میں"

اس نے ایک بند کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا اسے یہ سب کچھ معلوم ہے؟"

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"بھلا اس سے کونسی بات چھپائی جا سکتی ہے"

وہ اٹھی۔ اور دروازہ جلدی سے کھول کر کہنے لگی۔

"آجاؤ، روبی"

میرے سامنے ایک حسین وجمیل لڑکی کھڑی تھی جس نے سر کے بال تراشے ہوئے تھے۔ جو اس کے بھولے بھالے چہرے پر برسات کی گھٹاؤں کا سماں دکھلا رہے تھے۔ اس نے اس وقت سگریٹ ہونٹوں میں رکھی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی

rekhta

گول گول بھری ہوئی پنڈلیاں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک گزرا ہوا واقعہ گھوم گیا۔ جب میں چند دوستوں کے ساتھ نہر پر پکنک کے لئے گیا تھا۔ تو وہ لڑکی بھی اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ وہاں تھی۔ ان تمام لڑکیوں میں سے یہی ایک خوبصورت تھی۔ میرا دل نہ جانے کیوں اسے بار بار دیکھنے کو چاہ رہا تھا۔ اور میں اسے دیکھنے کیلئے کسی نہ کسی بہانے سے ادھر چلا جاتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی مجھے دیکھ رہی ہے۔

پھر انہوں نے گراموفون کھولا۔ اور انگریزی ریکارڈ بجانے لگی۔ وہ تمام لڑکیاں جھوم رہی تھیں۔ میں ان سے تھوڑی دور ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اور وہ مسکراتی ہوئی ایک آدھ بار مجھے دیکھ ہی لیتی تھی۔

پھر میں آہستہ آہستہ ان کے قریب چلا گیا۔ وہ تمام میری طرف متوجہ ہوئیں اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔

آپ کے پاس وہ ریکارڈ ہوگا۔ معلوم نہیں کون سی فلم کا ہے۔

نگاہیں کہہ رہی ہیں دل کا افسانہ

وہ مسکرا پڑی۔ اور کہنے لگی۔

"سوری مسٹر۔ ہمارے پاس کوئی اردو ریکارڈ نہیں ہے"

"اوہ میں سمجھا۔ آپ۔۔۔۔"

اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہو۔ میں تمام رات نہ جانے کیوں اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اور وہ سوچ دل کی انتہاہ گہرائیوں تک اتر چلی تھی۔

"آپ میری سہیلی کو دیکھ نہ جانے کہاں کھو گئے ہیں"

اس نے کھانس کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں"

میں چونک پڑا۔ میں نے اس کی نظروں میں شکایت کے بہت سے خط پڑھے۔

اب آپ جائیں۔ کہیں کوئی آپ کو یہاں نہ دیکھ لے"

"پھر کب ملاقات ہوگی"

"کل"

اس نے ڈینی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "اور ہاں یہ میری سہیلی ڈینی ہیں۔ یہ ان کا گھر ہے۔ اور یہ مسٹر۔۔۔۔

"میں ان کا بہت ممنون احسان ہوں"

میں نے ڈینی کی جانب دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ملاوٹ تھی اور ان میں مجھے بہت سے دیئے ٹمٹماتے نظر آ رہے تھے۔ میں ان کی تاب نہ لا سکا۔

"خدا حافظ"

اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

میں ہر روز وقت مقررہ پر وہاں جاتا۔ وہ میری منتظر ہوتی۔ مجھے دیکھ کر ایک لطیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آتی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ پھر ہم آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے کتنی کہانیاں، کتنے افسانے کہتے ہوئے اندر چلے جاتے وہ پلنگ پر بیٹھ جاتی اور میں اس کی رانوں کا تکیہ بنائے لیٹ جاتا تھا۔ میرے ایک لطیف سے اشارے پر اس کے کھلے بال آگے آجاتے تھے۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگتیں۔ پھر گلاب کی پنکھڑیاں اکٹھی ہو کر خمار کے جھولے جھولنے لگتیں۔ ہم اس عمل میں اس قدر کھو جاتے کہ آس پاس کا بالکل ہوش نہ رہتا۔ اور پھر وقت ختم ہو جاتا۔ شاید اسے ہماری محبت سے چڑ تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ اور ہم اس قدر نزدیک ہو گئے کہ جدا ہونے کے بعد اگلی ملاقات تک کسی بات کا دھیان ہی نہیں رہتا تھا۔ بس ہر وقت وہی خیال وہی مناظر آنکھوں میں چکر کاٹتے رہتا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میرے جسم کا کوئی

عضو مجھ سے علیحدہ ہو گیا ہو۔ یا مجھ سے سوچ سمجھ کی قوت چھین لی گئی ہو۔ میرے دل کی دھڑکن میں اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میری آنکھوں کی پتلیوں میں اس کی تصویر بسی ہوئی تھی۔ ہم یک جان دو قالب تھے۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی مجھے "ڈینی" کا خیال بھی آجاتا تھا۔ مجھے اس کی جھکی جھکی آنکھوں میں جذبات کا ایک طوفان چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایسے جان پڑتا تھا جیسے وہ اپنے آپ پر جبر کر رہی ہو۔ اس کی آنکھیں ہر وقت نم سی رہتی تھیں۔ اس کے چہرے پر نہ جانے کتنی ویرانی کتنا بسیرا کئے معلوم ہوتی تھیں۔

میں جب بھی وہاں جاتا مجھے اس گھر کے کونے کونے میں اس کی آنکھیں گھورتی معلوم ہوتیں۔ پھر میں ان سے بچنے کے لئے اس طوفان میں ڈوب جاتا جس کی پیٹھ میں آنے کے لئے ہم دونوں بے قرار تھے۔ میں ان زلفوں کی اوٹ میں چھپ کر بھی ان نگاہوں کو بھلا نہیں سکتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے "ڈینی" کے بارے میں پوچھنا چاہا۔ لیکن نہ جانے کیوں میری زبان پر یہ الفاظ نہ آسکے۔

"آپ کی سہیلی بہت اچھی ہے۔"

ایک دن میں نے باتوں باتوں میں پوچھ ہی لیا۔

"ہاں"

وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

"تم کیا سوچنے لگیں؟"

"کچھ نہیں ویسے ہی ایک خیال آگیا تھا۔"

وہ سامنے دیوار پر دیکھنے لگی۔

"شاید تم اسی کے بارے میں سوچ رہی ہو؟"

ہاں۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

ایسے لوگوں کے بارے میں سوچنا ہی پڑتا ہے۔

وہ کچھ بدمزگی سی محسوس کرنے لگی تھی۔ لیکن میں اس کی تہہ کو پہنچنا چاہتا تھا کہ "ڈینی" اس کے لئے اتنی بڑی قربانی کیوں کر رہی ہے۔

"کیسے لوگوں کے بارے میں"

میں نے ذرا انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"ڈینی جیسے"

"کیا اس میں کوئی خاص بات ہے"

"ہاں"

"مثلاً"

"آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی پوچھ رہے ہیں"

"میں" میں نے تعجب سے پوچھا۔

کیا آپ نے اس کی نگاہوں میں کچھ نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے سے کچھ نہیں کیا۔ آپ نے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کی فریاد نہیں سنی۔ کیا آپ اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے طوفان سے واقف نہیں ہیں۔ یہ وہی "ڈینی" ہے جس سے آپ کی ملاقات نہر پر ہو چکی ہے۔ کیا اس طوفان کے بپا ہونے میں آپ کا ہاتھ نہیں۔ آپ اسے جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہیں۔

"میری اس سے ملاقات ضرور ہوئی تھی۔ لیکن میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں جانتا"

میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا اس وقت آپ کی نگاہوں نے اسے محبت کا پیغام نہیں دیا۔ آپ کا دل اس کی رفاقت کے لئے [illegible]۔ آپ نے چاند اور ستاروں میں اسے تلاش

کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ نے خلاؤں میں کئی بار اس کی تصویر مکمل نہیں کی۔ آپ نے تصوری تصور میں اسے اپنے نزدیک محسوس نہیں کیا۔ کیا آپ نے اس کی یاد میں ٹھنڈی آہیں نہیں بھریں۔ مجھے صرف ان باتوں کا جواب چاہیئے"

"مجھے ان باتوں کا اعتراف ہے"

میں نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ اس کے بارے میں مجھ سے کیا دریافت کرنا چاہتے ہیں؟"

اس نے اپنے کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل دیتے ہوئے پوچھا۔

میں چپ ہو گیا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ کہ میں نے "ڈینی" کے بارے میں اس سے کیوں پوچھا۔ پھر جیسے خواب سے چونک پڑا۔ میں نے اس کے جوڑے کی جانب دیکھا۔ میں نے محسوس کیا۔ جیسے میرے تمام جسم کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہو۔ میں نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے اور بالوں کی گرہ کھولتے ہوئے کہا۔

"خدارا ایسا نہ کرو۔ ان گھٹاؤں کو یونہی جھومنے دو۔ میں ان کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہی اپنا پیار پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کی حسین تمناؤں کا گلا نہ دباؤ۔ ان کو یونہی بکھرے رہنے دو۔ حسین ستاروں کی مانند، آسمان پر بکھرے ہوئے ستارے کتنے حسین معلوم ہوتے ہیں اور اگر انہیں ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے، کہکشاں کی مانند، تو ان میں وہ حسن نہ چمک باقی نہیں رہتی یا وہ محض ایک ڈھیری کی صورت اختیار کر لیں گے۔ اور وہ نظروں کو ٹھنڈک کی بجائے ٹیس پہنچائیں گے"

اس نے سر کے ہلکے سے جھٹکے سے بالوں کو پھیلا دیا۔ جو اس کے شانوں پر ادھر ادھر پھیل گئے۔ بالکل آوارہ امیدوں کی مانند۔ اب میرے دل میں ایک نئی بات جاگ اٹھی تھی۔ اب میں ان دو طوفان کو اندر ہی اندر سلگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور وہ تم بار بار سامنے کیوں کر جھکنے کے لئے تیار ہو گئی تھی"

میں نے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا

یہ کہانی بھی ایک حادثہ ہے۔ جو ہماری زندگی میں رونما ہوا۔ "ڈینی" میری بہت پیاری سہیلی ہے۔ خواہ کیسی ہی بات کیوں نہ ہو۔ ہم ایک دوسری سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتیں۔ ملکہ دل کو اسوقت تک چین ہی نہیں پڑتا۔ جب تک ہم تمام باتیں ایک دوسری سے نہ کہہ دیں۔

جس دن میں نے آپ کو پہلے دن دیکھا۔ میں ٹانگے میں بیٹھی تھی۔ آپ اپنے گھر سے باہر آئے۔ آپ کی نگاہوں میں ایک پیغام تھا۔ ایک دعوت تھی۔ میں آپ کی ان پرکشش نگاہوں میں کھو کر رہ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں بیمار راستہ بھول کر آپ کے راستے میں آگئی ہوں۔ اور مجھے آپ کا پیغام آپ کی دعوت قبول کرتے ہی بنی۔ ورنہ مجھے اس کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ میں نے دل میں آپ کی محبت کو جگہ دی۔ میں نے پیار کا جواب پیار سے دیا۔ میری نظروں نے نہ جانے کتنے فسانے، کتنی کہانیاں آپ کی آنکھوں میں پڑیں۔ اور انھیں ہمیشہ کیلئے دل میں نقش کر لیا۔

میں وہاں سے چلی تو گئی۔ لیکن آپ کی محبت کو ساتھ لیتی گئی۔ دل میں ایک ہلکی سی ٹھیس اٹھتی تھی۔ جس نے میرا قرار چھین لیا تھا۔ میری راتوں کی نیند مجھ سے دور بھاگ چکی تھی۔ حسین آنکھوں میں کسی کا پیار بس جائے۔ ان میں نیند کا کیا کام ایک میان میں دو تلواریں کس طرح سما سکتی ہیں۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں آپ کا بہت اثر تھا۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں آپ کو دیکھتی اور پھر اس میں کھو کر رہ جاتی تھی۔ جیسے میں ایک بت ہوں یا ایک تصویر۔ نیم وا آنکھیں دھندلی دھندلی چیزوں کو گھورتی رہتی تھیں۔ اور میرا نچلا ہونٹ دانتوں کے درمیاں آہستہ آہستہ کٹتا رہتا تھا۔ پھر میرے منہ سے ہلکی سی ایک چیخ نکل جاتی تھی۔ اور میرے

خیالوں کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا۔ اور میں ہونٹ کو سہلانے لگ جاتی تھی۔ مجھے اس میں سے خون رستا معلوم ہونے لگتا تھا۔ میں اسے انگلی سے ہولے ہولے دباتی۔ تو مجھے ایک خاص قسم کا درد اور لطف معلوم ہوتا۔ اور یہ سلسلہ بدستور جاری رہا۔

"ڈینی" سے میری ملاقات کئی دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ میں ایک نئی دنیا میں اس قدر کھو چکی تھی کہ مجھے کسی اور بات کا دھیان بھی نہیں تھا۔ پھر ایک روز وہ میرے ہاں آئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اتنی خوش، جیسے دنیا جہاں کی نعمتیں اسے مل گئی ہوں۔ اس نے آتے ہی میری گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ اور چند بوسے میرے گالوں کے لے لئے۔ میں اس کی اس حرکت پر حیران تھی۔ مجھے اس دن محسوس ہوا کہ وہ جوانی کی دنیا میں پوری طرح داخل ہو چکی ہے۔ اس کے انگ انگ، اس کی ایک ایک حرکت سے جوانی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ مجھے اپنی سانس رکی رکی معلوم ہونے لگی۔ اور دل کی دھڑکن تیز مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی جس سے سوجی ظاہر تھی۔ میں نے اسے اپنی جانب کھینچا۔ وہ میرے اوپر آ رہی۔ اور اس کے ہاتھ نہ جانے کہاں سے کہاں تک فاصلہ بہت جلد طے کر گئے۔ مجھے ایک خاص قسم کی مسرت ہوئی۔ اور ایک عجیب و غریب مزہ۔ میرا دل چاہتا تھا۔ کہ وہ بار بار مجھ پر گرے اور یہ فاصلے بار بار طے کرتی رہے۔ میں نے اسے بناوٹی غصہ سے ڈانٹا۔ پرے دھکیل دیا۔ اب وہ بڑے روٹھے ہوئے انداز سے میری قریب بیٹھی تھی۔ اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ بند تھے۔ اور کھلے ماتھے پر غصے کے تھوڑے تھوڑے اثرات نمایاں۔ میں اس کی کمزوری سے واقف تھی جو ایسے وقت میں میرے کام آیا کرتی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ اور اس کی بغلوں کے نیچے گدگدی کرنے لگی۔ اس کا اکڑا ہوا جسم بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ اور وہ بری طرح ہنستے ہنستے فرش پر لیٹ گئی وہ ساتھ ساتھ میری منتیں کر رہی تھی۔

"آخر یہ تمہیں کیا سوجھی تھی۔ جو آتے ہی خرمستیاں شروع کر دی تھیں۔"

میں نے اسے چھوڑ کر سوال کیا۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں پھر سے شوخی عود کر آئی تھی۔ اور اس میں خوشی کو بھی کافی دخل تھا۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔ اتنی خوش کہ میرے ہونٹ، میری زبان، میرا دل، میرا دماغ، اس خوشی کے اظہار سے عاجزی ظاہر کر رہے ہیں۔ آج میں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا ہے۔

میں نے اسے محسوس کیا ہے۔"

اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے جھومتے ہوئے کہا۔

"زندگی — کیسی زندگی۔ ذرا میں بھی تو سنوں — بابا — میری سمجھ میں تیری پہیلیاں نہیں آنے سے رہیں۔ صاف صاف کہو۔"

میں نے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے پوچھا۔

سنو گی تو اچھل پڑو گی۔

"اچھل تو تم رہی ہو۔"

"تبھی تو کہہ رہی ہوں۔ کہ میرا اثر تم پر بھی نہ ہو جائے۔ سنا نہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ اور پھر خود ہی بولی۔

"میرا خیال ہے کہ اچھلنے کی بجائے جلنے لگو گی۔ میرا مطلب ہے حسد کرنے لگو گی۔"

"میں کیوں کرنے لگی حسد — حسد کریں میرے دشمن۔ میں کوئی ایسی ویسی ہوں بھلا۔"

میں نے غصے کے لہجے میں کہا۔

اوہو تو میری بنو ناراض ہو گئیں۔ جناب میرا مطلب تمہیں ناراض کرنے کا نہیں۔ بس بات ہی کچھ ایسی ہے۔ اگر نہیں سننا چاہتی ہو۔ تو نہ سنو۔ اب میں چلتی ہوں۔

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر پھر بٹھا لیا۔ اور اس کی ٹھوڑی کو اونچا کر کے پوچھا۔

کچھ کہو گی بھی۔ یا نخرے سے کئے جاؤ گی۔

وہ مسکرا دی۔ اور میرے کان کے نزدیک منہ لا کر بولی۔

"آج ملاقات ہوئی ہے۔"

"کس سے"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

بس کچھ نہ پوچھو وہ ظالم نہ جانے کہاں سے میرے راستے میں آ گیا کہ میں اپنا راستہ بھول گئی۔ اور سب کچھ بھول کر اس کے راستے میں آ گئی۔"

وہ آنکھیں بند کئے کہہ رہی تھی۔ کہ مجھ میں ضبط کی طاقت نہ رہی۔ اور میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہے وہ؟"

وہ ہے۔ اس کا گورا گورا رنگ۔ تندرست و توانا جسم۔ گھنگرالے خوبصورت بال، لمبا سرو سا قد۔ اس کی کالی کالی خوبصورت آنکھیں اب تک میری آنکھوں میں گھوم رہی ہیں۔ یوں محسوس کر رہی ہوں۔ جیسے اس کی تصویر میرے دل میں مکمل ہو چکی ہو۔"

"میں پوچھتی ہوں۔ وہ کون ہے"

میں نے چیخ کر پوچھا

"مجھے معلوم نہیں"

"پھر تم سے کہاں ملاقات ہوئی"

"نہر پر"

وہاں ڈوبنے کیلئے گئی تھی کہا۔

"ڈوبیں میرے دشمن۔ ہم تو پکنک کیلئے گئے تھے۔ وہ بھی وہاں موجود تھا۔ وہ بار بار آنکھیں چرا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں بھی دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ آنکھیں ملی تھیں۔ نظریں ٹکراتی تھیں۔ پھر ایک طوفان اٹھا جس کی زد میں ہم دونوں آگئے۔ لیکن اپنے دل کا حال نہ کہہ سکے۔ اور وہ طوفان میرا چین و قرار، راتوں کی نیند اور دل کا آرام چھین کر لے گیا۔ اب میں بہت جلد اس سے ملنے والی ہوں۔ اس سے اپنے دل کی بات کہنے والی ہوں۔ میں اپنا سب کچھ اس پر نثار کرنے والی ہوں۔ وہ میرے من مندر کا دیوتا ہے۔ میں اس کی داسی ہوں۔ اس کی کنیز ہوں"

وہ کہہ رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس جا رہی ہو۔ کیوں۔ جانتے ہو میرا دھیان کہاں تھا۔ تمہاری جانب میں تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق تمہاری شکل میری آنکھوں میں گھوم گئی۔ گورا گورا رنگ، تندرست و توانا جسم، گھنگھریالے خوبصورت بال۔ نہ جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگا۔ جیسے تم مجھ سے بہت دور جا رہے ہو۔

"کیا ہوا تم اس قدر کھو کیوں گئی ہو"

اس نے مجھے ہلاتے ہوئے پوچھا۔

میں چونک پڑی جیسے مجھے خوابوں کی دنیا سے میری اصل دنیا میں واپس

بلا لیا ہو۔ یا مجھے نیند سے جگا دیا ہو۔

"ہوں"

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب ہے کیا سوچ رہی ہو"

"میں بھی ایک ایسی ہی دنیا میں کھو گئی تھی۔ جس دنیا میں تم نے اپنے آپ کو گم کر دیا ہے۔ میں نے اپنا دل و دماغ، چین و قرار ایک ایسے شخص کو سونپ دیا ہے جسے میں بالکل نہیں جانتی۔ ہماری۔ ہماری ملاقات بھی سر راہے ہوئی۔ پھر دلوں کے سودے ہو گئے۔ لیکن پھر خریداروں کی ملاقات نہ ہو سکی۔

"وہ کون ہے کیسا ہے"

اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

"بالکل ویسا ہی۔ جس کا ذکر تم نے کیا ہے۔ وہ بھی کچھ خوبصورت نہیں"

میں نے خوشی سے کہا۔

لیکن اگر میرے .... اس کو دیکھو گی۔ تو بس دل تھام کر رہ جاؤ گی۔ اور حسد کرنے لگو گی"

اس نے میرے گالوں پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔

اور اگر تم اسے دیکھ لو گی۔ تو بس سب کچھ بھول کر اسے دیکھتی رہ جاؤ گی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہوش و حواس ہی نہ کھو بیٹھو۔ بالکل چاند ہے۔ آسمان کے چاند سے کہیں زیادہ خوبصورت، زمیں کا چاند، میرے دل کو ... کرنے والا۔

ہم دونوں ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر تعریف کر رہی تھیں۔ آخر فیصلہ ہوا کہ کسی موقعہ پر انہیں دیکھ کر صحیح فیصلہ کیا جائے۔ جس لئے ہم کافی دیر سے جھگڑ رہی تھیں۔

موسم بہار کا آغاز تھا۔ سردی اپنے پر لپیٹ چکی تھی۔ جاڑے کے ہاتھوں ستائے ہوئے چرند پرند بھی سکون کی سانس لینے لگے تھے۔ بڑا خوشگوار موسم تھا باغ باغیچے رنگ برنگے پھولوں سے پٹے پڑے تھے۔ خزاں کے ہاتھوں لٹے ہوئے درختوں کے قافلے نئی کونپلوں کی سوداگری میں پھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اداس بلبلیں پھر سے چہچہانے لگی تھیں۔ اور غمگین بھونروں کے دل نئی شگفتہ کلی کا رس چوسنے کیلئے بے تاب تھے۔ خزاں کے ہاتھوں برباد شدہ پتے حسرت بھری نظروں سے اپنے لٹے ہوئے گھر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اور ان نئے باسیوں کی زندگی پر رشک کر رہے تھے۔ جو نئے نئے ان کی جگہ آباد ہوئے تھے۔ اور وہ اپنی گذشتہ زندگی کو یاد کر کے آہیں بھر رہے تھے کتنے اچھے دن تھے۔ جب وہ ہوا کے دوش پر لہرائے ہوئے اٹھکیلیاں کیا کرتے تھے۔ ٹہنیاں انھیں جھولا جھلایا کرتی تھیں۔ یاد نہیں انھیں لوریاں سنا کر ان کا

کا دل بہلایا کرتے تھے۔ اور اب وہ انھیں بھول کر تازہ پتیوں سے پیار و محبت کے قصے کہہ رہی تھیں۔

اداسی دلوں پر پھر سے نئی امنگ پیدا ہو گئی تھی۔ محبت کے گیت گائے جا رہے تھے۔ زندگی میں ایک نئی روح پیدا ہو چکی تھی۔ محبت کے عہد و پیماں کرنے والے باغ کے کسی گوشے میں چھپے ہوئے دلوں کی باتیں آنکھوں اور سرگوشیوں کی زبانی کر رہے تھے۔ پھر پھول کی جانب ہاتھ بڑھتا، اور کسی کے بالوں کی زینت بن جاتا۔ اچانک دوسرا ہاتھ تیزی سے دوسرے پھول کو بے دردی سے ٹہنی سے جدا کرتا۔ اور کسی کا کالر مزین ہو جاتا تھا۔ آنکھیں ملتیں۔ مسکراہٹیں پھیل جاتی ارمان مچل اٹھتے۔ دل دھڑکنے لگتے۔ ہونٹ کپکپاتے اور آنکھوں میں نیلے رنگ کے ڈورے تیرنے لگتے تھے۔

میری ایک سہیلی کی سالگرہ تھی۔ ڈینی بھی وہاں مدعو تھی۔ اسلئے ہم نے اکھٹے جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ وہاں پر اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ چند واقف لڑکیوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ ویسے تو میں اس قسم کی تقریبات سے بہت گھبراتی ہوں۔ لیکن پھر بھی باتوں باتوں میں شام ہو گئی۔ طبیعت پر ایک قسم کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اجازت لی۔ اور جلدی سے باہر آ گئیں۔ کہیں کوئی اور واقف نہ مل جائے اور پھر رکنا پڑے۔

کھلی سڑک پر آ کر اطمینان کا سانس لیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کال کوٹھری سے نکل کر ایک کھلی اور وسیع دنیا میں سانس لیا ہو۔ وہاں کی گھٹن سے ابھی تک سر میں درد تھا۔ لیکن خنک ہوا کے چند جھونکوں سے طبیعت کچھ بحال ہو گئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کھلی فضا میں گھوم پھر کر مکدر پن دور کروں سامنے جناح باغ تھا اور میں وہاں کسی الگ جگہ پر بیٹھ کر چند سکون کے سانس لینا چاہتی

تھی۔ میں نے دبی زبان میں ڈیزی سے کہا۔ شاید وہ پہلے ہی سے تیار تھی فوراً رضامند ہو گئی۔

شام کی رنگینیاں زوروں پر تھیں۔ خنک ہوا چل رہی تھی۔ جو اداس دلوں کو تازگی بخش رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں ہوا کے ساتھ یونہی اڑتی چلی جاؤں۔ دور تک آسمان کی پہنائیوں میں، یہاں تک کہ میں اس نیلے آکاش تک پہنچ جاؤں۔ اور وہاں ہمیشہ کیلئے چاند اور چند ستاروں کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کروں۔ اور ہمیشہ کے لئے وہاں رہ جاؤں۔

سڑک پر بہت سے لوگ آجا رہے تھے۔ کچھ پیدل، کچھ سائیکلوں پر تانگے اور کاریں بھی تھیں۔ ان میں سے کچھ باغ کی جانب جا رہے تھے۔ اور کچھ ادھر سے آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر مسرت اور پھولوں کی تازگی تھی اور آنکھوں میں کلی سا نکھار۔

میں نے ڈیزی کی جانب دیکھا۔ اس کے کٹے ہوئے بال اِدھر اُدھر بکھر چکے تھے۔ اور ہوا کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ اور وہ تھوڑی دیر کے بعد ہاتھوں سے انہیں جمانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس کی اسکرٹ جسم کے ساتھ چپکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے کی جانب اس کے جسم کے ابھار بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ لیکن وہ اس سے بالکل بے خبر تھی۔

میں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ اس وقت بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس سے لپٹ جاؤں۔ اور پھر اسے اس قدر بھینچوں کہ اس کے تمام ابھار پھر سے اس کے جسم کے ساتھ چپک کر رہ جائیں۔ جیسے وہ ابھرے ہی نہ ہوں۔ میرا دل آہستہ آہستہ دھڑکتے دھڑکتے تیزی اختیار کر گیا اور سانس بھی رکتا [illegible] معلوم ہونے لگا۔ آنکھیں

پپوٹے بوجھل ہو چکے تھے۔ اس نے میری مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔

" آج یہ ہوا نہ جانے کیوں تم سے اٹکھیلیاں کر رہی ہے "

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس کے تمام جسم کا جائزہ لے کر کہا۔

اس کی نظریں اپنے جسم سے گزر کر مجھ پر آ ٹکیں۔ اور آنکھیں نچا کر بولی۔

" مجھ سے زیادہ اسے آپ کا خیال ہے "

میں نے جلدی سے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ میرا دوپٹہ گلے میں لہرا رہا تھا۔ جیسے پرندے کے اڑتے وقت پر لہراتے ہیں۔ اور پھر میری قمیض کی حالت بھی کسی طرح ڈیزی کے سکرٹ سے کم نہ تھی مجھے شرم سی محسوس ہوئی اور میں نے جلدی سے قمیض کو درست کر کے دوپٹہ اپنے گرد لپیٹ لیا۔ بالکل کسی دیہاتی لڑکی کی مانند۔

پہلا سایہ تھوڑی دیر کیلئے رکا۔ اس نے کھانس کر اپنا گلا صاف کرنا چاہا۔ اس کی آواز بجھتے ہوئے پانی کی مانند آہستہ آہستہ ڈوب رہی تھی۔ اس کے دانتوں کے بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا تمام جسم سردی سے کانپ رہا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ چھت سے ٹپکتی ہوئی بوندیں اس پر گر رہی تھیں۔ اس نے ان سے بچنے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن ناکام رہا مسلسل بارش کی وجہ سے تمام چھت ٹپکنے لگی تھی۔

" بھائی آپ کے پاس سگریٹ ہوگا "

پھر کچھ جواب نہ پا کر وہ ایک دو بار کھانسا۔ اور پھر بولا۔

"ہاں میں آپ کو اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔ یہ تمام باتیں اس نے مجھ کو خود کہی تھیں۔ لیکن اب وہ مجھ سے بے وفائی کر گئی۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ وہ کہہ رہی تھی"

"باغ میں خوب چہل پہل تھی۔ نوجوان لڑکوں کی بے شمار ٹولیاں لڑکیوں کے تعاقب میں پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ ان پر قسم قسم کے آوازے کس رہے تھے۔ ہم بھی ان سے نہ بچ سکیں۔

"یار بہار تو اب آئی ہے"

"لیکن گرمی کو ساتھ لئے"

"یار کیا کلیاں ہیں"

"اُماں پھول کہو پھول"

"نہیں بند کلیاں"،

"بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے"

ہمارا تمام نشہ ختم ہو چکا تھا۔ ہم نے ان سے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کے قہقہے ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ ہم جلدی سے وہاں کے ہوٹل میں گھس گئیں۔ اور پردے کے پیچھے جا کر جلدی سے ایک خالی میز پر بیٹھ گئیں۔ تمام جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اور سانس پھول چکی تھی۔ ہم نے ایک دوسری کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں نے رومال نکال کر چہرہ صاف کیا۔ اور ایک لمبی سانس بھری۔ "ڈینی" میز پر نظریں جمائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس وقت وہ شوخ و طرار، بہت معصوم معلوم ہو رہی تھی اور پھر میں بھی نہ جانے کہاں کھو گئی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کا چہرہ بالکل دھندلا دھندلا سا معلوم ہو رہا تھا۔ اور خیالات نہ جانے کہاں ڈوب چکے تھے ۔۔۔!

میں بیرے کی آہٹ پر چونک پڑی۔ لیکن وہ نہ جانے کن اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکی تھی، وہ بدستور اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیا پیو گی ۔۔۔ گرم یا ٹھنڈا"

میں نے اس کے قریب منہ لے جا کر پوچھا۔

"ہوں۔ جو چاہو"

اس نے چونک کر جواب دیا۔

"میرا خیال ہے ٹھنڈا بہتر ہو گا"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"ابھی تو موسم گرما میں دیر ہے"

"پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے ...."

میں نے مسکرا کر کہا۔

اس نے جلدی سے رومال نکال کر ماتھے کو رگڑا۔ اور بیرے کو چائے لانے کا کہہ کر میری طرف مخاطب ہوئی۔

"آج کی سیر مہنگی پڑی ہے"

"تمہیں تو ٹھنڈے پسینے آ رہے ہیں"

میں نے پھبتی کسی۔

"میں تو ایسا سبق دیتی کہ ساری عمر یاد کرتے"

اس نے اکڑتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن اب وہ کون سا بھول جائیں گے۔ ساری عمر دل پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی آہیں بھریں گے بیچارے ۔۔۔ ایک بار دیکھا اور دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ کی رٹ لگائیں گے ۔۔۔!

وہ شرما سی گئی۔ اور ناخن سے میز پر کچھ لکھنے لگی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب میں شفق کی لالی پھیل چکی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے نیلے آسمان میں لاکھ کے بہت سے پھول کھل گئے ہوں۔ آسمان کی پہنائیوں میں بے شمار پرندے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ باغ کی رونق بڑھ چکی تھی۔ ہوٹل کی تمام میزیں بھر چکیں تھیں۔ بیرے سفید وردیاں پہنے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش میں تھے۔

ریڈیو پر ایک سستے قسم کا فلمی گانا ہو رہا تھا ؎

جہاں بھی میں جاتی ہوں وہیں چلے آتے ہو
چوری چوری میرے دل میں سماتے ہو۔ تم ہی بتاؤ کہ تم میرے کون ہو

میں اس گانے میں اس قدر کھو چکی تھی۔ جیسے میں خود تم سے پوچھ رہی ہوں اور یہ تمام الفاظ میری زبان سے نکل رہے ہیں۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں تمہیں ہر وقت اپنے پاس اپنے سے نزدیک محسوس کرتی ہوں کوئی پل کوئی لمحہ ایسا نہیں گذتا جب تم مجھ سے علیحدہ ہوتے ہو۔ تمہاری یاد ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ دن کے اجالے اور راتوں کے اندھیارے میں بھی۔ بلکہ راتوں میں یہ یاد ایک درد ایک کسک بن کر ابھرتی ہے۔ جو نیند کو دھکیلتی ہوئی نہ جانے کون سی اجاڑ وادیوں میں لے جاتی ہے۔ جہاں سے وہ لوٹ نہیں سکتی تمام رات اسی طرح کٹ جاتی ہے۔ چاند مجھ پر مسکراتا ہے اور ستارے میری ہنسی اڑاتے ہیں۔

پھر میں چونک پڑی۔ بیرا چائے کے برتن میز پر رکھ رہا تھا۔ ڈینی سامنے پہاڑی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جہاں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور ادھر سے آنے والی ہوا ان سے چرائی ہوئی بھینی بھینی خوشبو بکھیرتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ فضا کا رنگ گہرا ہو رہا تھا۔ اور آسمان پر ہلکے بھورے رنگ کے بادلوں میں سیاہی کا مزید اثر پڑ چکا تھا۔

"جانِ من۔ ذرا اپنے نازک ہاتھوں سے چائے تو بناؤ"

میں نے ڈینی سے کہا۔

اس نے پہاڑی پر سے نظریں ہٹا کر میری جانب دیکھا۔ اور پھر قدرے توقف سے بولی۔

"یہ کام تو تمہیں سرانجام دینا ہوگا۔ اور پھر میں نے بہت دنوں سے تمہارے ہاتھ کی چیز ہی نہیں کھائی۔ چائے ہی پی لیتے ہیں"

"اب تم بہت کام چور ہو گئی ہو۔"

میں نے یونہی ظاہری غصہ سے کہا۔

"کام چور اور میں — بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے"

"اچھا کام چور نہ سہی دل چور ہی سہی۔ لو میں چائے بنائے دیتی ہوں"

میں نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی —؟"

اس نے تعجب سے پوچھا۔

"اس بچارے کی حالت کا اندازہ تو لگاؤ جس کا دل تمہارے پاس ہے اور وہ نہ جانے کہاں سڑکوں پر بھٹکتا، ڈینی — ڈینی پکارتا پھر رہا ہوگا۔ اور تمہیں اس کا ذرہ بھر خیال نہیں ہے، سچ سچ۔ مجھے تو اس بے چارے پر ترس آرہا ہے، مگر واہ رے عشق تیرا نام بربادی ہے۔ چینی کتنے چمچ ڈالوں۔"

میں نے اس کے کپ میں چینی ملاتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن آپ کو اس کا خیال کرنا چاہیے۔ جس کی حالت قابل رحم ہے۔ وہ

ہر وقت دل پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا ہے۔ سنتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سب رہنموں کا جانشین تصور کرتا ہے۔ اور یقینی ہے کہ اس کی حالت سے بے خبر بیابان میں مزے اڑا رہی ہے۔ جیسے دو چہچہے کافی ہوں گے۔"

ڈیزی نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے جواب میں ایک ہلکا قہقہہ لگایا۔ اور پیالے کی پیالی اس کی جانب بڑھا دی۔ چائے کی گرم گرم اٹھتی ہوئی بھاپ اپنے ہونٹ اور پر موسم میں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ریڈیو کی آواز بدستور گونج رہی تھی۔ اور اس میں ملی جلی لوگوں کی باتیں عجیب معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے کسی پر اسرار جگہ سے بہت سی آوازیں آ رہی ہوں۔ آسمان کا رنگ اور گہرا ہو چکا تھا۔ ہلکا سرمئی رنگ سیاہی میں منتقل ہو رہا تھا۔ میں نے کپ اٹھا کر منہ کو لگایا اور ایک ہلکی سی چسکی لے کر جلدی سے میز پر رکھ دیا۔ چائے کافی گرم تھی۔ اور اس میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

سامنے پہاڑی پر سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ میں نے جلدی سے ادھر دیکھا۔ تو آپ کو ایک دوست کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا۔ میری نظریں آپ پر گڑی ہوئی تھیں۔ اور آپ نہ جانے کن خیالات میں غرق باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ڈیزی کی جانب دیکھا۔ وہ اسی طرح سوچ میں ڈوبی چائے کے کپ میں آہستہ چمچ ہلا رہی تھی۔

"ڈیزی۔ ڈیزی"

میں نے بڑی آہستگی سے اسے پکارا۔

"ہوں"

"وہ دیکھو ۔۔۔ سامنے پہاڑی پر"

"کیا ہے وہاں"

"وہی"

"وہ کون"

"وہ جو میری تمناؤں کا مرکز، میرے دل کی دھڑکن اور میرے خوابوں کی تعبیر وہ جو سفید پتلون پہنے ہوئے ہیں۔ کتنا پیارا معلوم ہو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھاگ کر اس کا دامن تھام لوں اور اس سے لپٹ جاؤں۔ اور اسے کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں۔ اور اسے اپنی آنکھوں میں پلکوں کے نیچے یوں چھپا لوں۔ بالکل آنکھوں کی پتلیوں کی مانند۔ جیسے کسی پیارے پنچھی کو پنجرے میں بند کر لیا جاتا ہے۔ اور وہ ہے کہ ساتھیوں کا کام بنی ان کھنڈروں سے لوں۔"

میں نے یہ تمام باتیں ایک ہی سانس میں کہہ دیں۔ پھر میں نے ڈیزی کی جانب دیکھا جو بغور ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈتا معلوم ہو رہا تھا۔ اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ جیسے موت اور زندگی کی حد پر کوئی آخری ہچکی لے رہا ہو۔

"ڈیزی ۔۔۔ کیسے ہیں وہ ۔۔۔ تم نے کچھ کہا نہیں۔ میں تو ویسے ہی جیسے ہی کہا کرتی تھی ۔۔۔ تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ کہیں حسد کی آگ تو بھڑک نہیں اٹھی۔

میری نظریں آپ پر تھیں۔ اور سوال اس سے کر رہی تھی۔

"ہاں ۔۔۔ بہت اچھے ہیں ۔۔۔ بہت ہی اچھے"

وہ جلدی سے اٹھی۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی دی۔ میں

اور اس نے اس میں سے ایک گھونٹ بھی نہیں پیا تھا۔ میں نے ایک بار آپ کی جانب دیکھا۔ اور پھر اٹھ کر ڈینی کو پکارنا چاہا۔ لیکن وہ بہت دور جا چکی تھی۔

میں نے جلدی سے بل ادا کیا اور اس کے پیچھے چلنے لگی۔ میرے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا اور کیسے ہوا۔ ڈینی نے ایسی حرکت کیوں کی اس میں ضرور کوئی راز ہوگا۔ اور میں یہ سب معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھی۔

جب میں ڈینی کے ہاں پہنچی۔ تو وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا منہ تکیے میں چھپا رکھا تھا۔ میں اس کے قریب ہی پلنگ پہ بیٹھ گئی۔ اور بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ڈینی۔ تمہیں آج کیا ہو گیا ہے — تم اتنی جلد وہاں سے کیوں بھاگ آئی ہو —"

اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ بالکل اسی طرح پڑی رہی۔ میں اس کی اس حالت پر حیران ہو رہی تھی۔ میں نے اسے زور سے ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"ڈینی — کچھ تو کہو"

میں نے بڑی مشکل سے اس کا چہرہ تکیہ سے علیحدہ کیا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے اشکوں کی لڑیاں ٹوٹ رہی تھیں جو اس کے خوبصورت گالوں کو تر کرتی ہوئی تکیہ میں ہی جذب ہو رہی تھیں۔

"تم رو رہی ہو ڈینی ——"

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں"

اس نے جیسے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کئے ہوں۔

"آخر اس کی کچھ وجہ بھی تو ہو"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"ڈینی —— خدا را کچھ تو کہو۔ اب مجھ میں مزید انتظار کی طاقت نہیں۔

کچھ نہیں —— ایسی کوئی بات نہیں"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی بات ضرور چھپا رہی ہے —— میں نے رومال سے اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کیا۔ اور میں نے ایک مرتبہ پھر اس سے دریافت کیا۔

"ڈینی —— پیاری ڈینی۔ تمہیں میری قسم کچھ تو بتاؤ۔ اگر مجھ سے کوئی بات چھپاؤ گی۔ تو تمہاری قسم میں تم سے کوئی بات نہیں کروں گی۔

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کی آنکھوں کا سیلاب بہہ نکلا ہو۔ اور میں اس سیلاب میں بہتی ہوئی نہ جانے کہاں پہنچ چکی ہوں۔ اور آنسو تھے کہ بہتے ہی جا رہے تھے۔ میرا کندھا بھیگ چکا تھا۔ اور اس کا سر بھی تر ہو رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے کندھے سے علیحدہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی تر آنکھوں میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس کے ہونٹ بار بار کھلتے تھے۔ اور وہ اسے بند کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اس کے خوبصورت بال پریشان تھے۔ اور چہرے پر معصومیت کا راج تھا۔

میں کافی دیر تک اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اس کے پریشان بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ میں نے اس کے کھلتے اور بھنچتے ہوئے ہونٹوں کی آواز کو سننا چاہا میں اس کی معصومیت کے اتھاہ سمندر میں ڈوب کر اس کے دل کا حال معلوم کرنے کے لئے بے قرار تھی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو ایک لفظ بھی ادا کرنے سے معذور پایا۔ میرا دل ایک انجانے خوف سے اپنی رفتار سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا میری سانس تیزی اختیار کر چکی تھی۔ اور آنکھوں میں بھرے ہوئے اشکوں میں ڈینی کا چہرہ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ میں کیا کروں کیا نہ کروں۔ میری زبان میری خواہش کا احترام کرنے سے انکار کر چکی تھی میرا دل ڈینی سے وہ راز جس نے اسے اس حالت تک پہنچا دیا تھا معلوم کرنے کے لئے بے قرار تھا۔

ڈینی کے آنسو تو رک گئے۔ لیکن آنکھوں میں بھرا پیکراں بیقرار نظر آ رہا تھا۔ اب وہ کندھے پر میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے لال رخساروں پر بہنے والوں، اشکوں نے کئی لکیریں بنا دی تھیں۔ اس کے ہونٹ ادھ کھلے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس کی نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی ہیں اس سے نگاہیں چرا کر یونہی سامنے دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کئی بار تھوک نگلنے کی کوشش کی۔ لیکن میرا گلا خشک ہو چکا تھا۔

"پھر تم نے کچھ نہیں بتایا —— ڈینی"

میں نے یہ الفاظ بمشکل ادا کئے۔

"سن لو گی"

ڈینی کی بھرائی آواز سنائی دی۔

میں نے ڈینی کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں اسی طرح میرے چہرے پر تھیں اور اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ سرخی دوڑ چکی تھی۔ اور وہ اپنے

خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کر رہی تھی۔

"کہو — کچھ تو کہو"

میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر زور سے ہلاتے ہوئے کہا "اب مجھ میں مزید انتظار کی طاقت نہیں"

"تو سنو —" وہ تھوڑی دیر کے لئے رکی۔ اس نے ایک مرتبہ کمرے کا مکمل طور پر جائزہ لیا۔ اور کھانس کر کہنے لگی۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ کہ میں وہاں سے کیوں چلی آئی۔ یہاں تک کہ میں نے چائے بھی نہیں پی۔ نہ جانے اس وقت کونسی طاقت تھی۔ جس نے مجھے وہاں سے چلے آنے پر مجبور کر دیا۔ اگر میں وہاں سے نہ چلی آتی تو مجھے ڈر تھا۔ کہ میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتی جو ہمارے لئے ناخوشگوار ثابت ہوتی جب تم نے پہاڑی کی جانب اشارہ کر کے بتایا۔ تو میں اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ میری تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ جب میں نے اسے دیکھا۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میرے انگ انگ کا سنگار ہو گیا میری آنکھوں کی چمک بیدار ہو گئی، لیکن دوسرے لمحے تمہارے الفاظ میری ان حسرتوں، خوشیوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میرا انگ انگ سوتا معلوم ہونے لگا اور میری آنکھوں کی چمک میری بصیرت پر گراں گزری۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی، کہ ہماری محبت ایک ہی محور کے گرد گھوم رہی ہے۔ ہم نے اپنے ارمانوں کو ایک ہی دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا ہے ہم نے اپنی آنکھوں کی نیندوں کا قرار ایک ہی شخص کے سپرد کر دیا ہے۔ اف کتنے ارمان تھے۔ جو خون بن کر بھی نہ بہہ سکے۔ جو نیندیں کسی کی یاد کے سپرد تھیں، اب اس کی بیوفائی کے حوالے کر دی ہیں، میں نے محبت کی منزل کا ہم سفر اسے منتخب کیا۔ جو پہلے ہی اپنا سب کچھ لٹا چکا تھا۔ میں بہت بدقسمت ہوں

بہت بدقسمت"

وہ پھر سے رونے لگی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، یہ کیسے ہوا اور کیونکر ہوا۔ میں حیران تھی، کیا ڈینی سچ کہہ رہی ہے۔ ڈینی نے میرے ساتھ مذاق تو نہیں کیا۔ کئی قسم کے سوالات میرے ذہن میں گونج رہے تھے ان کا جواز ڈھونڈنے کی اپنے آپ میں ہمت نہیں رکھتی تھی۔

"ڈینی۔ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے"

میں نے دل کی تسلی کیلئے پوچھ ہی لیا۔

"ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ ہو چکا ہے"

ڈینی نے جواب دیا۔

"مجھے کس طرح یقین آئے۔ میرا دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ ڈینی

میں نے اپنے ابلتے ہوئے دل کی بھاپ کو آنکھوں میں جذب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دل تو میرا بھی نہیں مانتا۔ لیکن دماغ سب کچھ مانتا ہے"

ڈینی وہاں سے اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اور نہ جانے باہر کیا دیکھنے لگی، میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے دوراہے پر کھڑی پایا۔ جہاں سے ایک راستہ آگے جاتا تھا۔ لیکن ادھر جانے کیلئے اپنی ایک عزیز سہیلی کو کچل کر جانا ہوگا۔ اور دوسرا راستہ جہاں سے اپنے دل کے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر گزرنا ہوگا — آخر میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ میں دوسرا راستہ اختیار کروں گی۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب گئی۔

"ڈینی"

"ہاں"

"میں... نے فیصلہ کر لیا ہے"

میں نے بڑے ضبط سے کام لے کر کہا۔

"کیا فیصلہ"

اس نے گھوم کر میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ڈینی مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس سے اس قدر محبت کرتی ہو۔ میری جا تو اس سے بس سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اور آج تو میں نے محض مشورے کیلئے تو تم سے پوچھ لیا تھا۔ بھلا پہلی ملاقات میں بھی محبت ہوئی ہے کبھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر تم پسند کرو گی تو اس بارے میں سوچا جائے گا۔ اور پھر جب وہ تم سے محبت کرتا ہے تو بھلا مجھ سے کیوں کر کرنے لگا۔ اچھا ہوا۔ کہ مجھے ابھی سے پتہ چل گیا ورنہ نہ جانے میں کیا کچھ سوچتی ـــــ خیر..... تمہیں تمہاری محبت مبارک ہو خدا کرے کہ تم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کیلئے جگہ ہو۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لئے زندہ رہو۔ ایک ہی منزل کی طرف خوش خوش قدم بڑھاؤ"

میں نے یہ الفاظ کہنے کو تو کہہ دیئے۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی پہاڑ کے نیچے پسی جا رہی ہوں۔ میرا دل بھر آیا۔ اور آنکھیں پھر سے تر ہو گئیں۔ میں نے جلدی سے منہ پھیر کر آنکھوں کو اس سے اوجھل کرنے کی کوشش کی۔ میرا گلا رندھ ہو گیا تھا۔ میں نے جلدی سے رومال نکال کر آنکھوں کو خشک کیا۔ اور کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

ڈینی مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ لیکن میں نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ میرے بالکل سامنے آ کر رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں اب تک اشکوں کا

راج تھا۔ اور وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ پھر اس نے پلکوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے پانی کو باہر اچھال دیا۔ اور گرم گرم قطرے میرے بازوؤں پر گرے۔ میں نے محسوس کیا۔ جیسے پگھلتا ہوا سیسہ مجھ پر ڈال دیا گیا ہو۔ میں نے اس کی جانب دیکھا وہ کچھ کہنے کے لئے بے قرار نظر آ رہی تھی۔ اور مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔ کہ میں اس سے کچھ دریافت کر سکوں میرا دل غموں کے بوجھ سے دبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا۔ لیکن ڈینی کے ہاتھ میرے کندھوں کو دبائے ہوئے تھے۔ میں پھر سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

اس نے اپنے بہتے ہوئے اشکوں کو انگلی سے خشک کیا۔ اور بڑی مشکل سے بولی۔

"یہ سچ ہے کہ میں اس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں جس طرح مجھے اپنی زندگی سے پیار ہے میں یہ سمجھے ہوئی تھی۔ شاید میں نے زندگی کا صحیح مقصد پا لیا ہے۔ اور یہ سچ بھی تھا۔ کیوں کہ زندگی نام ہے پیار و محبت کا۔ اس کے سوا زندگی یوں ہے جیسے شراب کی خالی بوتل یا کاغذ کا پھول۔ اور پھر انسان تمام عمر میں ایک بار محبت کرتا ہے۔ اور وہی محبت اس کی زندگی کی راہبر ہوتی ہے لیکن میں نے جو کچھ کیا۔ ایک جذبے کے تحت کیا۔ میں نے اس بارے میں بالکل نہ سوچا۔ خواہ میری نادانی کہہ لیجئے یا بے وقوفی۔ بعض مرتبہ انسان ایسے راستے بھی اختیار کر لیتا ہے۔ جو اسے منزل مقصود پر نہیں لے جاتے۔ بلکہ کسی ایسی جگہ پر پہنچاتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر انسان کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ وہ مجبور ہوتا ہے۔ اور وہ یونہی بھٹکتا رہتا ہے۔ نہ ہی وہ اپنی منزل کو پا سکتا ہے۔ اور نہ ہی اپنے پہلے مقام پر واپس آ سکتا ہے۔ جہاں سے چلا تھا!

اب میں نے بہت سوچا سمجھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں۔ کہ میں جیسے اپنی منزل خیال کرتی رہی ہوں۔ وہ میرے لئے سراب تھا، دھوکا تھا۔ میں نے خزاں کو بہار سمجھا، اس میں میرا اپنا قصور ہے خزاں کا نہیں، میری اپنی سمجھ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ میں نے محسوس کیا ہے۔ کہ جو کچھ میں نے سوچا تھا غلط ہے۔ میں نے اس سے پیار ضرور کیا۔ لیکن مجھے بالکل خیال نہ تھا کہ پیار مجھے زندگی کی لمبی شاہراہ پر اس کے دوش بدوش لے جائے گا — نہیں — بالکل نہیں — میں سوچ رہی ہوں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی ہو سکے گا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک دیوار حائل ہے۔ اور وہ دیوار ہے مذہب کی دیوار۔ جو کسی صورت میں ہمیں ایک نہیں ہونے دے گی۔ خواہ ہم ایک جان دو قالب کیوں نہ ہوں۔ وہ ہمیں علیحدہ کئے بغیر چین نہیں لے گی۔ انگلیاں اٹھیں گی لوگ طعنے دیں گے زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے گی۔ میں محض اپنے مفاد کیلئے دو اور زندگیوں کو کیوں دکھوں، تکلیفوں میں ڈالوں۔

اور پھر ان کا اور تمہارا مذہب ایک زندگی ایک۔ تمہارا مذہب تمہیں اجازت دے سکتا ہے۔ تم ایک ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہو۔ ایک ساتھ پیار کو پروان چڑھا سکتے ہو۔ تمہاری منزل ایک ہو سکتی ہے تم ایک ڈال کے پنچھی ہو۔ بھلا میں کیوں تم دونوں کے درمیان آنے لگی، تمہیں تمہارا پیار مبارک ہو۔ اور مجھے میری بربادی،

وہ اٹھی اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئی، میں اسے پکار بھی نہ سکی۔ مجھے اندر کنڈی چڑھانے کی آواز سنائی دی۔ لیکن میں اسے پکار بھی نہ سکی۔ چپکے سے اٹھی۔ اور ایک نظر بند دروازے پر ڈالی اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے باہر آ گئی۔

اس نے مجھے ڈینی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ جب وہ مجھ سے اس کے بارے میں کہہ رہی تھی۔ تو بعض موقعوں پر مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ڈینی میری جانب بازو پھیلائے بڑھ رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک خمار ہو۔ ایک نشہ ہو اور وہ میری بالکل قریب آ جاتی ہو، اور پھر اچانک رک کر پھر مجھ سے بہت دور چلی جاتی ہو، پھر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔ جیسے وہ سینہ پھاڑ کر باہر اچھل پڑے گا۔

وہ شام کافی اداس کٹی۔ جب میں گھر پہنچا۔ تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بہت تھک گیا ہوں بدن میں شدید درد تک محسوس کر رہا تھا، طبیعت پر ایک بوجھ سا تھا۔ میں کمرے میں آ کر کرسی پر گر پڑا۔ اور ماتھے کو ہاتھ سے رگڑنے لگا، مجھے ڈینی کی آنکھیں اب تک گھبراتی معلوم ہو رہی تھی۔ اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے آنکھ ملا سکوں۔ ان میں مجھے چھپے ہوئے نشتر معلوم ہو رہے تھے

جو میرے دل کو آہستہ آہستہ چھلنی کرتے معلوم ہو رہے تھے۔

کو تو رات تھی۔ لیکن میں ایک منٹ کے لئے بھی نہ سو سکا۔ نیند تو مجھ سے سوتیلوں کا سا سلوک کر رہی تھی۔ میری آنکھیں اس کے انتظار میں جھپکنا بھول گئیں تھیں تمام رات کروٹیں بدلتے بدلتے کٹ گئی۔ صبح دم جب میں نے دیکھا تو بستر کی چادر سلوٹوں سے دوچار تھی۔ تمام جسم ٹوٹتا معلوم ہو رہا تھا۔ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جیسے میں بہت دنوں سے بیمار ہوں۔

تمام دن بڑی مشکلوں سے کٹا۔ شام کو ڈینی کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوا۔ تو ڈینی کا چہرہ نظروں میں گھوم گیا۔ پھر مجھے کوئی طاقت مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کو کہہ رہی تھی۔ میں گھر سے چل پڑا۔ لیکن تمام راستہ وہ دماغ پر چھائی رہی۔ پھر میں ان کے دروازے کے سامنے رک گیا۔ دروازہ بند تھا۔ اور مجھ میں کھٹکھٹانے کی طاقت نہیں تھی۔ یوں جان پڑتا تھا جیسے ڈینی مجھ سے کہہ رہی ہو۔

"تو بے وفا ہے۔ تو ہرجائی ہے"

اور میں وہاں سے واپس چلا آیا۔ پھر جب بھی میں نے کبھی وہاں جانے کے بارے میں سوچا، تو وہ آنکھیں گھورتی معلوم ہوتی تھیں، اور وہ آواز میرے دماغ میں ہتھوڑے کی مانند پڑنے لگتی تھی۔

کافی دن گزر گئے۔ ایک دن میں ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ جہاں ڈینی کا کالج پڑتا تھا۔ میں یونہی اُدھر جا نکلا۔ چند لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں ادھر اُدھر کھڑی تھیں، مجھ میں کسی سے بھی پوچھنے کی ہمت نہ تھی پھر ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ میں نے اس کے قریب جا کر ڈینی کے بارے میں پوچھا۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اس نے ایک اور لڑکی کو بلایا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"آپ کو ڈینی سے ملنا ہے"

دوسری لڑکی نے مجھ سے سوال کیا۔

"جی"

میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"کونسی ڈینی۔ روبی"

پہلی لڑکی نے دوسری سے مخاطب ہو کر پوچھا

وہی شیش محل والی"

"جی کیا فرمایا آپ نے شیش محل والی ....."

میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

وہ دونوں میری حیرانگی پر مسکرا پڑیں۔ ان میں سے ایک نے تھوڑے فاصلہ پر کھڑی ہوئی ایک اور لڑکی کو پکارا۔

"ارے او گلنار"

وہ لڑکی لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی آن پہنچی۔ اس کے پتلے اور چپکے ہوئے منہ پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ .....

سوالیہ نظروں سے ان کی طرف گھور رہی تھی۔

"اوہ ڈینی کہاں ہے"

اس لڑکی نے اس سے پوچھا۔

"ڈینی — ابھی تو یہیں تھی۔

"آپ کو اس سے ملنا ہے۔

اتنا کہہ کر وہ دونوں لڑکیاں چلی گئیں۔ گلنار — اب تک مسکرا رہی تھی

جانب لے جایا جا رہا ہو۔

آپ کراچی سے آ رہے ہیں کیا؟

جی ہاں ..... جی نہیں میں لاہور ہی سے آ رہا ہوں،

میں نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا کئے

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ڈینی کہاں ہے"

میں نے جلدی سے پوچھا۔

"معاف کرنا میں تو بھول ہی گئی تھی، آپ یہاں ٹھہریئے۔ میں اسے بُلا لاؤں"

——— وہ چلی گئی، میں نے رومال سے چہرہ صاف کر کے

تسکیں کا سانس لیا۔ اور رومال سے ہوا کرنے لگا۔ اتنے میں ڈینی آ گئی وہ مجھے دیکھ کر حیران تھی۔ کہ میں وہاں کیوں کر چلا گیا تھا۔ گلنار اب تک اس کے ساتھ تھی۔ پھر ڈینی کے اشارے سے وہ چلی گئی۔

"آپ کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا"

ڈینی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے سوچا آپ سے مل ہی لوں"

یہ کام گھر پر بھی ہو سکتا تھا۔ اور پھر آپ اتنے دنوں نہ جانے کہاں رہے وہ بچاری ہر روز شام کو انتظار کرتی تھی۔ اور پھر نا امید ہو کر لوٹ جاتی تھی اس کے چہرے پر نہ جانے کتنی حسرتیں جسیرا کئے تھیں کتنے ارمان اپنے دل میں لے کر گھر لوٹ جاتی تھی، ۔ اور اب .....

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ میں بہت بے تاب تھا۔ میں نے جلدی سے

"اور اب ـــ جلدی کہو ڈینی۔ تم رک کیوں گئی ـــ جلدی کہو"

"اور اب وہ چند دنوں سے نہیں آئی۔ شاید وہ بالکل نا امید ہو چکی ہو۔ اور پھر میں بھی ان کے ہاں نہیں جا سکی"

"میں آج شام آؤں گا۔ ہو سکے تو اسے اطلاع کر دینا"

شام کو جب میں ان کے ہاں پہنچا، تو ڈینی وہاں موجود تھی۔ میری نظریں اس کی بجائے کسی اور کی متلاشی تھیں۔ لیکن وہاں اور کوئی نہ تھا۔

"بیٹھئے"

ڈینی نے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے وہ پلنگ تھا۔ جہاں میں زلفوں کی اوٹ میں چھپ کر پیار و محبت کے بیکراں سمندر میں ڈوب جاتا تھا، میں نے تصور ہی تصور میں محسوس کیا۔ کہ میں اس کی نرم و نازک ران پر سر رکھے میں اس سے کہہ رہا ہوں ؎

ترا دل دھڑکتا رہے گا
مرا دل دھڑکتا رہے گا
زمیں پر سہانے لمحے آتے جاتے رہیں گے
ستارے چمکتے رہیں گے
مگر میری چاہت کا جذبہ
یہ وحشی کا نغمہ
رہے گا ہمیشہ
میرے دل کے اندر
میرے پاس پاس
آج کی رات
میرا دل
چاہتا ہے تو رہے میرے پاس ؎

میں خیالوں میں چونک پڑا۔ ڈینی بالکل میرے سامنے پلنگ پر بیٹھی تھی اس کے چہرے پر معصومیت کا قبضہ تھا۔ اور آنکھیں ویران تھیں۔ اس کی نظریں میرے اوپر سے ہو کر سامنے دیوار پر پڑ رہی تھیں۔

"ڈینی"

ہوں۔ اس کے لب ہلے۔

"تم آج اکیلی کیوں ہو"

میں نے اس سے انہیں ملاتے ہوئے کہا۔

"میں آج ادھر نہیں جا سکی۔ اور نہ ہی پیغام بھجوا سکی — اور پھر وہ بھی تو کئی دن سے نہیں آئی، نہ معلوم کیا وجہ ہو"

اس نے بدستور دیوار پر گھورتے ہوئے جواب دیا۔

میں ایک جذبے کے تحت جلدی سے اٹھا۔ اور ڈینی کے ساتھ پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرا بازو اس کی کمر میں ڈال دیا۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ وہ بری طرح کانپ رہی ہے۔ اس کا چہرہ غصہ لال ہو رہا تھا، اور وہ میری گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی سعی کر رہی ہے۔ میں نے اسے اپنی جانب گھسیٹ کر اسے چوم لینا چاہا، لیکن میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اور وہ بدستور اپنے آپ کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور جا کر دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کٹے ہوئے بال بکھر چکے تھے۔ اور کپڑے بے ترتیب تھے، اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"ڈینی — یہاں آؤ۔ ڈینی"

میں نے اسے پکارا۔

وہ چپ چاپ میری جانب دیکھتی رہی۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اپنے کپڑوں کو ٹھیک کرنے لگی۔

"ڈینی۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں کیا؟"

میں نے سوال کیا۔ لیکن وہ اب بھی خاموش تھی۔ "کہو ڈینی میرے سوال کا جواب دو۔"

"ہاں"

اس نے بمشکل جواب دیا۔

"پھر مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہو۔ میرے قریب آجاؤ، اتنے قریب۔ کہ میں تمہیں محسوس کر سکوں۔ اور جی بھر کر دیکھ سکوں۔ تمہیں چھو سکوں۔"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تم دو کشتیوں میں سوار ہونا چاہتے ہو۔ تم آج تک اس سے محبت کا دم بھرتے آئے ہو۔ جس کی آنکھوں میں تم نے جھانک کر دیکھا ہے، جس کے ہونٹوں کا لمس محسوس کیا ہے۔ جس کی سانس سے تمہاری گرم گرم سانس ٹکراتی ہے۔ تم نے اس کے دل کی دھڑکن بہت قریب سے سنی ہے۔ اور اب مجھ سے محبت جتلا رہے ہو۔ تم محبت کرنا ہی نہیں جانتے۔ تم محبت کے نام سے بھی آشنا نہیں ہو۔ تم نے تو محض نام سن رکھا ہے۔ محبت محبت کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے پہلے اپنے اندر جھانک کر دیکھ۔ کہیں شیطانیت انسانیت پر تو غالب نہیں آگئی۔ کہیں تمہاری خواہشات نے محبت کو تو دبوچ نہیں لیا سوچو۔ غور سے سوچو۔ تم نے یہ الفاظ کسی اور سے تو نہیں کہے۔ ضرور کہے ہیں کیونکہ میں نے سنے ہیں۔ میرے کان مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔" وہ رو رہی تھی۔ اور اس کے آنسو بہہ بہہ کر فرش کو گیلا کر رہے تھے۔ "میں نے تم سے محبت ضرور کی ہے۔ اسے میری نادانی کہہ لیجئے۔ یا بے وقوفی سے موسوم کریں۔ لیکن جب مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ تمہاری نظروں میں کوئی اور بھی ہے تو میں نے اپنی محبت کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا۔ میں نے تمہیں اپنے

ہاں لانے کے مواقع فراہم کئے۔ محض اس لئے۔ کہ میں اپنے دل کو سمجھا سکوں، اور پھر میں یہ چاہتی تھی۔ کہ تم دونوں محبت کی آخری منزل تک پہنچنے کے لئے ایک ہی راستہ اختیار کرو۔ تم جیون ساتھی بن جاؤ۔ کیونکہ یہ میرے لئے نہ ممکن تھا، اور تمہارے لئے بھی ۔۔۔ اور آج تم میری بجھی ہوئی آگ کو ہوا دینا چاہتے ہو۔ تم تو حسن کے بندے ہو۔ تمہیں محبت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ تم میرے جذبات کو بھڑکا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو ـــــ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں محض تمہیں اسی محبت کی بنا پر معاف کرتی ہوں۔ ورنہ ـــــ جاؤ شاید وہ تمہارا منتظر ہو۔ آئندہ میرے بارے میں کبھی بھی نہ سوچنا۔"

وہ جلدی سے باہر نکل گئی، میں اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا شام ہو چکی تھی۔ اور کمرے میں اندھیرا چھانے لگا تھا، میں جلدی سے اٹھا۔ میں نے صحن میں سسکیوں کی آواز سنی۔ میرا دل ایک بار پھر سے دھڑکا۔ میں نے ٹھٹک کر دیکھا۔ ڈینی دیوار سے لگ کر کھڑی رو رہی تھی۔ ایک بار نظریں ملیں۔ لیکن اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا میرا دل مجھ پر لعنت و ملامت کرنے لگا۔ اور میں جلدی سے باہر آگیا میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، میں اب اس سے کس طرح مل سکوں گا۔ جس کے گیتوں میں کھو کر ڈینی کی باتوں کو بھلا سکوں گا مجھے تو اس کے گھر کا بھی پتہ نہیں تھا۔ مجھے یہ سب کچھ ڈینی سے پوچھ لینا چاہئے تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ تو ڈینی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میرے لئے ہمیشہ کے لئے۔ میں نظریں جھکائے گھر کی جانب چلنے لگا۔ نہ معلوم کب تک چلتا رہا۔ جب گھر پہنچا۔ تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ اور ماں میرا انتظار کر کے سو چکی تھی۔ میں چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ رہا

لیکن ڈینی کے الفاظ ہتھوڑے کی مانند میرے دماغ پر پڑتے معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر بتی بند کی۔ کیونکہ مجھے اپنے سے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں بھی میں اس مصیبت سے چھٹکارا نہ پا سکا۔

میرے دل میں اس کی یاد کچھ اس طرح بس گئی تھی۔ جیسے اس کے لمبے لمبے گھنے بالوں سے آنے والی بھینی بھینی خوشبو میری دماغ میں گھر کر جس کا نکالنا میرے اپنے لئے بہت محال تھا۔ بعض مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ بہت اداس ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اور بڑی حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تو میری آواز گلے میں رک جاتی ہے، وہ کچھ کہنے کو منہ کھولتی ہے۔ تو آواز گھٹ کر رہ جاتی ہے۔"

میں چونک پڑا۔ میرے قریب سے ایک جوڑا ہنستا ہوا گزر گیا۔ میں صبح سے باغ کے بنچ پر بیٹھا اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں لمبے چوڑے غلط سلط خیالوں میں الجھا اپنے حالات کی موٹی ڈوریوں میں تانا بانا سلجھانے میں مصروف تھا، کبھی میرا جی چاہتا تھا۔ کہ دور کہیں کھلی فضا میں بھاگ جاؤں۔ جہاں میرے اور اس کی یاد کے سوا کچھ اور نہ ہو۔ میں ہمیشہ اسی کو یاد کرتا رہوں اسی

کے خیالوں میں ڈوبا رہوں۔ لیکن مجھے اس نیند سے جگانے والا کوئی نہ ہو

شام ہو چکی تھی۔ آسمان پر کوؤں کی لمبی قطاریں اڑتی جا رہی تھیں۔ ان بکھری قطاروں کو دیکھ کر میرے دل میں لاوا سا ابلنے لگا۔ ایسی کتنی شامیں میں نے رنگینیوں میں صرف کی ہیں۔ اور میں رات کی سیاہی کو بھول کر زلفوں کے اندھیرے میں گم ہو جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اندھیرے مشرق سے مغرب کی جانب اپنے پنجے بڑھا رہا تھا۔ اور اجالا اپنے آپ کو اس کی زد سے بچانے کے لئے مغرب کی جانب دور افق میں سمٹتا جا رہا تھا۔ پھر اندھیرے نے مکمل غلبہ پا لیا۔ بجلی کے بلب روشن ہو گئے۔ اور اندھیرے کے دامن کو تار تار کرتی ہوئی روشنی کی ایک لہر دوڑ سی گئی۔ آسمان پر چمکنے والے ستارے بھی جھانکنے لگے تھے۔

میں وہاں سے اٹھ گیا۔ کیونکہ میرے قریب ہی کھمبے پر بلب روشن تھا اور میں اس سے دور رہنا چاہتا تھا۔ مجھے اندھیرے سے پیار ہو گیا تھا۔ اور میں اسی میں ڈوب کر اپنی زندگی کے دن کاٹنا چاہتا تھا۔ اندھیرا جو اپنے اندر نہ جانے کتنے راز لئے ہوئے ہے۔ اس نے نہ جانے کتنے گنہگاروں کو پناہ دے رکھی ہے۔ اندھیرا زندگی کا ایک اہم حصہ۔ اہم دور۔ میں وہاں سے اٹھ کر اندھیرے میں ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ اور مشرق سے طلوع ہوتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگا۔ جو آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ اس کا چہرہ لال تھا۔ اور پھر زردی میں تبدیل ہونے لگا۔ اور پھر اندھیرے میں چاندنی نے اپنا اثر پیدا کر لیا۔ مجھے اپنے تھوڑے فاصلے پر کچھ کھسر پھسر سنائی دی۔ میں نے غور سے دیکھا تو قریب ہی دو سائے گھاس پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پھر میں ادھر متوجہ ہوا۔ اور اندھیرے میں غور سے دیکھنے لگا۔ نسوانی آواز کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ شاید کوئی اور ہو۔ آواز ضرور ملتی جلتی ہے"

میں سوچنے لگا۔ اب میں ذرا اور قریب ہو کر انھیں دیکھا۔ عورت، اور مرد۔ عورت کا منہ دوسری جانب تھا۔ اور مرد کا چہرہ چاندنی میں کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ مرد ادھیڑ عمر کا تھا۔ البتہ چہرے پر بشاشت کے اثرات تھے۔ اور وہ عورت کے منہ کے قریب منہ لے جا کر باتیں کر رہا تھا۔ ویسے تو یہ میرے لئے کوئی دلچسپی کی بات نہیں تھی۔ لیکن عورت کی آواز نے مجھے شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔

"میں چند روز سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ آپ بہت پریشان سی ہیں"

مرد کی آواز سنائی دی۔

"نہیں تو ـــ بھلا میں کیوں پریشان ہونے لگی" نسوانی آواز آئی

"مجھے انتہائی افسوس ہے۔ کہ میں آپ کو وہ چیز نہ دے سکا۔ جو میرے حقوق میں داخل ہے" مرد بولا۔

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے ـــ ایسی باتوں کا"

"نہیں نہیں۔ لیکن میں تمہارے دکھ نہیں دیکھ سکتا۔ میں مجبور تھا اور جو کچھ ہوا ایک مجبوری کے تحت ہوا۔ میں معافی چاہتا ہوں"

پھر عورت کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ اور مرد اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"تم رونے لگیں ـ بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے بہت ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ لیکن ....

[illegible] قصے کو جانے دیجئے۔ لیکن

آپ کو شاید کوئی دوسرا موضوع ہی نہیں ملتا۔ یا شاید آپ، مجھے پریشان کرنے میں خوش ہوتے ہیں۔ خدارا آئندہ ایسی باتیں نہ کرنا، ورنہ ...."
میں اٹھ کھڑی ہوئی، مرد کو بھی مجبوراً اٹھنا پڑا۔ اور وہ دونوں اندھیرے میں گم ہوگئے اور میں وہیں بیٹھا اس آواز کے بارے میں سوچنے لگا۔

"ضرور وہی تھی" میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔

"لیکن یہ مرد کون ہو سکتا ہے، اسے کونسا ایسا دکھ ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس قدر پریشان ہو رہی تھی، نہیں نہیں کوئی اور ہوگی، بھلا وہ شام کے وقت ایک غیر مرد کے ساتھ یہاں کیوں آنے لگی۔ اس کی شامیں تو میرے لئے فقط میرے ... وقف ہیں۔ میرے سوا اس کے ساتھ کسی کا ہونا ہی ناممکن ہے۔ میں نے ضرور دھوکا کھایا ہے۔ بہت سی آوازیں ایک سی ہو سکتی ہیں۔ بعض دفعہ تو آسانی سے دھوکا کھا جانا کوئی بعید نہیں"

مختلف قسم کے خیالات میرے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے۔ اور اس کا مسکراتا ہوا چہرہ چمکتی ہوئی آنکھیں۔ اور اس کے کھلے ہوئے کالی گھٹاؤں کے سے بال، میرے ذہن میں گاڑی کے پہیے کی طرح چکر کاٹ رہے تھے، میں آنکھیں بند کر کے اس کے تصور میں کھو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اندھیرے میں بہت سے لال پیلے جگنو سے چکر کاٹ رہے ہوں، میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ قریب کے درخت سے کسی پرندے کے پھڑ پھڑانے کی آواز سنائی دی اور پھر وہ اڑتا ہوا اندھیرے میں کھو گیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے اپنے سوا کوئی دوسرا انسان دکھائی نہ دیا۔ میں وہاں سے اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے گھر کی جانب چل پڑا۔ تمام راستے سنسان تھے۔ البتہ بجلی کے بلب بدستور اونگھتے معلوم ہو رہے تھے۔ میں سڑک کے درمیان ہو کر چلنے لگا۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا

جیسے مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے میرے پاؤں سے کئی کئی من کے پتھر باندھ دیئے گئے ہوں۔ میرے کانوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ جیسے اس کے گلے میں گھنٹیاں ہوں۔ یا جل ترنگ کو کسی نے آہستہ سے چھیڑ دیا ہو۔ اور میں اپنے آپ اس آواز میں گھلا دینا چاہتا تھا۔ میں اسی میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ نہ جانے کہاں تھی۔ میری آنکھوں سے دور میری نظروں سے اوجھل، اس کی یہ اداس شامیں کیوں کر کٹتی ہوں گی۔ جب کہ وہ میرے لئے اس قدر بے قرار ہوتی تھی۔ جب تک میں وہاں نہیں جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوتی تھیں۔ اس کا چہرہ اداس ہوتا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں حسرتیں کروٹ لیتی معلوم ہوتی تھیں۔ اور جب میں وہاں پہنچ جاتا تھا تو اداسی خوشی میں اور حسرتیں کامیابی میں تبدیل ہو جاتی تھیں نہ جانے اب وہ کس قدر غم زدہ ہوگی۔ کتنی حسرتیں دم توڑ چکی ہوں گی۔ اس کے تر ہونٹوں پر پپڑیاں جم چکی ہوں گی۔ اس کے لمبے گیسوؤں میں نہ جانے کب سے خوشبو عنقا ہو چکی ہوگی۔ اس کی ریشم کی سی ران کسی کے سر کا بوجھ اٹھانے کو بے قرار ہوگی۔

مثل یوسف سر بازار پڑے پھرتے ہیں
کیا ہی شرماؤ اگر کوئی خریدار نہ ہو

دور سے کسی نے اچھی لے میں یہ شعر پڑھا۔ میں تڑپ گیا۔ اور میں اس آواز کی جانب کھنچتا چلا گیا۔ ایک اندھا سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کا سہارا لئے بیٹھا تھا۔ میں اس کے قریب جا کر رک گیا۔

"کون ہو بھئی"

اس نے مجھ سے پوچھا

کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کی بے نور آنکھیں کچھ دیکھنے کو سخت بیتاب تھیں۔ آخر اس نے اپنا ڈنڈا پکڑ کر پھر سے پوچھا،

"کون ہے۔ کچھ تو جواب دو۔"

"بابا۔ میں ہوں۔ یعنی میں ادھر سے گذر رہا تھا۔ آپ نے شعر پڑھا۔ آپ کی آواز مجھے ادھر کھینچ لائی۔ نہ جانے کون سی ایسی کشش ہے آپ کی آواز میں۔ میں نے سوچا شاید کچھ میرے غم کا مداوا ہو سکے گا۔" میں یہ تمام باتیں ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

"ہو۔ ہو۔ ہو۔ تم اپنے غم کا مداوا ڈھونڈنے آئے ہو۔ یا میرے غم کو بڑھانے۔ میں تو محض ایک کسک کو جو میرے دل میں اٹھتی ہے۔ اس کے دبانے کے لئے کبھی کبھی کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہوں۔ ورنہ یہاں اس لمبی چوڑی دنیا میں غم کے سوا اور کیا ہے۔ غم کھاؤ، ہنسی پیو۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔" وہ ہنسا۔ اور کہنے لگا۔

شب وصال کی کوتاہیوں کا شکوہ کیا
یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لالے ہیں

تمہارے شعر نے اس آگ کو جو میرے دل میں سلگ رہی تھی اور بھڑکا دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ آگ شعلے بن کر میرے تمام ارمانوں کو جلا کر بھسم کر دے اب میں اس آگ میں جلنے کو بالکل تیار ہوں۔ اسے اور جلاؤ۔ آگ کو اور ... یا۔ اور بڑھاؤ۔"

... میں نے اس کے کندھوں سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

... شاید تم کسی سے محبت کرتے ہو۔ تمہیں کسی سے محبت نہیں ہے۔ ... محبت کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں۔ تمہیں تو اس کی ابجد بھی معلوم ...

نہیں۔ ورنہ یہ الفاظ کبھی نہ کہتے۔ محبت کی آگ بھڑکانے کے لئے نہیں ہوتی وہ سلگنی چاہیئے کیونکہ جب آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ کسی کو معاف نہیں کرتی۔ اس کے راستے میں جو چیز بھی آ جائے گی خاک بن کر رہ جائے گی۔ اور خاک بننے کے بعد کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس کے برعکس جو آگ آہستہ آہستہ سلگتی ہے وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اور وہ سب کچھ جلنے پر بھی اندر ہی اندر چنگاری کی مانند دبی رہتی ہے پھر یک لخت بھڑک اٹھتی ہے۔ یہی حال محبت کا ہے۔ وہ سلگتی ہوئی آگ کی مانند ہے۔ جو اندر ہی اندر سلگتی رہے۔ لیکن اس وقت اسے بھڑکنا نہیں چاہئے لیکن تمہاری محبت تو بہت جلد بھڑک اٹھی۔ تم محبت نہیں کر سکتے مجھ سے پوچھو۔ میں نے محبت کی ہے میں نے اپنا سب کچھ ختم کر دیا۔ لیکن اب تک مجھے اس سے محبت ہے۔ اور آج جب کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں بلکہ آنکھیں تک نہیں ہیں۔ اور میں اسے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ لیکن میرے دل میں اس کی یاد کروٹیں لے رہی ہے۔

درد دل لذتیں صرف شب غم ہو گئیں
طول فرقت سے بہت بیتابیاں کم ہو گئیں
ہم نشیں دیکھی بخوبی داستان ہجر کی
محبتیں جتنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

اندھا اٹھا۔ اور آہستہ آہستہ چل پڑا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ مجھ سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ اور میں پھر سے ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ایک انتہائی گہری سوچ میں۔ پھر دور سے گھڑیال کی آواز سنائی دی۔ بارہ بج چکے تھے۔ میں وہاں سے ہٹ کر سڑک پر آ گیا۔ اندھے کی باتیں میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھیں۔

جب میں گھر پہنچا۔ تو ماں انتظار کرتے کرتے سو چکی تھی۔ اس کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ میں اسے بجھا کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے باہر کی جانب کھلنے والی کھڑکی کھول دی۔ چاند سر پر آچکا تھا۔ اس لئے اس کی چاندنی کھڑکی کے اندر نہیں آرہی تھی۔ سامنے کی تمام فضا چاندنی میں نہا چکی تھی۔ بڑے بڑے درخت خاموش کھڑے تھے۔ مکان بھی کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے جیب سے سگرٹ نکالا۔ سگرٹ سے نکلتا ہوا دھواں ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا اور اس دھوئیں میں اسے تلاش کرنے لگا۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کا نقشہ مکمل کر لیا۔ اس کے گیسو پھیل چکے تھے۔ لیکن کھڑکی سے باہر چاندنی تھی۔ بھلا گیسوؤں کے اندر چاندنی کیسے پہنچ سکتی ہے وہاں تو اندھیرا ہے۔ صرف اندھیرا۔ پھر میں چاندنی میں کیا تلاش کر رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ اور سگرٹ کو پاؤں تلے مسل کر اندھیرے میں کھو گیا۔

برسات کے دن تھے، آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ہوا کی دیویاں نشے پر پھیلائے کانٹوں سے الجھتی، شاخوں کو چھیڑتی، پھول سونگھتی پھر رہی تھیں میں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا آسمان کی پہنائیوں میں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ گرمی سے ستائے ہوئے لوگوں کے لئے یہ مژدہ تھا۔ لیکن میں اپنے آپ کو اداس محسوس کر رہا تھا۔ میں اس منظر میں غرق ہونے کے باوجود اس سے لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا میرے لئے یوں ہے کسی مرجھائے ہوئے پھول پر کوئی اوس کا قطرہ آگرے۔ لیکن وہ اس کے لئے کوئی فائدہ مند نہ ہو۔ میرا دل خزاں رسیدہ تھا۔

تھوڑی دیر کیلئے جھونپڑے میں خاموشی چھا گئی۔ بجلی چمکی اندھیرے نے ایک لمحہ کے لئے اپنے پر سمیٹے اور پھر کھول دیئے۔ جیسے اونچی اڑان میں

چنچی بھونرے سے پر سمیٹے لیکن پھر زمین پر آ رہنے کے خوف سے اپنی پرواز جاری رکھنے کو پر کھول دے۔ پھر بادل زور سے گرجا۔ اب کی بار یہ دہشتناک آواز آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ البتہ ایک بار پھر زور سے کڑکا۔ جھونپڑے کا تمام فرش تر ہو چکا تھا۔ اور بالکل کیچڑ بن چکا تھا۔ پہلا سایہ شاید باتیں کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ لیکن پھر اسے خاموشی سے اکتاہٹ کی محسوس ہوئی۔ اور وہ ایک دو بار زور سے کھانسا۔ اور بولا۔

"یہ طوفان تو طوفانِ نوح سے کسی صورت میں کم معلوم نہیں ہوتا۔ اور پھر کپڑے بھی تو بری طرح بھیگ چکے ہیں۔ اور بارش تو رکنا ہی نہیں چاہتی۔ کیا سوچ رہے ہو دوست۔ کچھ باتیں تو کرو۔ شاید تم نے چپ کا روزہ رکھ چھوڑا ہے۔ اور پھر مجھے تو تمہارے بارے میں کچھ شک کا گزر رہا ہے کہیں گونگے تو نہیں ہو میاں ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔

میرے دماغ میں باغ والی آواز بار بار گونج رہی تھی۔ آواز بالکل اسی کی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور وہاں نہیں تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا — لیکن وہ کون تھا۔ وہ مرد اس کے ساتھ کون ہو سکتا ہے۔ وہ رات کے اندھیرے میں اس کے ساتھ باغ میں تھی اور وہ بھی اکیلی — اف میرے خدا مجھے کیا ہو گیا ہے کہیں میرے کان کو دھوکا نہیں کھا گئے تھے۔ میں نے بہت برا کیا جو اسے نہ دیکھا۔

نہ جانے کتنے خیالات تھے جو میرے ذہن میں بار بار ابھر رہے تھے۔ اور پھر ایک کر کے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ میں تھا تو سراپا اس کا منتظر۔ میری آنکھیں اسے دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں۔ میرے کان اس کی آواز سننے کے لئے سخت بے قرار تھے۔ میرا دل اس کے لئے دھڑکتا

چاہتا تھا۔ میرے ہونٹ اس کے گرم گرم ہونٹوں کا لمس محسوس کرنے کے لئے بہت بے تاب تھے۔ میں نے کبھی اتنی بے تابی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن ڈینی کی باتوں نے مجھے اور بے قرار کر دیا تھا۔ میں اس سے ملنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ لیکن مجھے ان میں کوئی تاثیر نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں یونہی بے خیالی میں گھر سے نکل پڑا۔ موسم خوشگوار تھا۔ سڑکوں پر کافی چہل پہل تھی۔ لوگ گھروں سے سیر کے لئے نکل پڑے تھے۔ آسمان پر بادل مست ہاتھی کی مانند جھومتے گزر رہے تھے۔ زندگی میں تازگی کا رنگ آ گیا تھا۔ میں بے خیالی میں چلتا ہوا انارکلی پہنچ گیا۔ وہاں بڑی بھیڑ تھی۔ سجی ہوئی دکانوں میں لوگ آ جا رہے تھے۔ اور دکاندار انھیں نپٹانے میں جلدی کر رہے تھے۔ سارے بازار میں عجیب گہما گہمی تھی۔ میں دکانوں پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالتا ہوا اپنے خیالوں میں گم گزر رہا تھا۔

میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرے ہونٹ وہیں ساکت ہو گئے اور نظریں سامنے ساکت ہو گئیں۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آ رہی تھی اس کی نظریں اب تک مجھ پر نہیں پڑی تھیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مجھے اپنے تمام جسم میں رعشہ سا معلوم ہونے لگا۔ میں رک گیا۔ اب وہ میرے بالکل قریب آ چکی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بہت بدل چکی تھی، نہ جانے کیسے۔ لال گورا گورا رنگ پیلاہٹ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ آنکھیں جیسے بے جان ہوں۔ بھرے بھرے گال گڈھے بن چکے تھے۔ اور آنکھوں کے نیچے سیاہی پھیل گئی تھی۔

میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ مجھ پر سے نظریں ہٹا کر ایک دکان کے اندر دیکھنے لگی

قریب آکر رک گیا۔ اس نے ایک بار غور سے مجھے دیکھا۔ اور پھر اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ثمینہ تم رک کیوں گئیں"

"میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ ان سے ملو۔ یہ میرے بچپن کے دوست ہیں، ہم بہت عرصہ ایک ساتھ کھیلے ہیں۔ بہت اچھے ہیں یہ۔ انہیں پرویز کہتے ہیں"

ثمینہ نے میری طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا ـــ "اور یہ میرے ہزبینڈ (Husband) مسٹر ضیا" اس نے پھر دکان کے اندر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا

"ہزبینڈ" ـ میں بڑبڑایا

"آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی مسٹر پرویز"

ضیا نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

میں کچھ نہ بولا۔ صرف اسے دیکھنے لگا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا چہرے پر بشاشت ضرور تھی۔ لیکن اس میں کچھ اور تفکرات بھی ملے جلے معلوم ہو رہے تھے۔ سر کے بال کھچڑی تھے ـــ البتہ اس نے کافی قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ جس سے اس کی امارت کا پتہ چلتا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو ـ اس وقت"

ضیا نے پوچھا۔

ذرا یونہی چہل قدمی کے لئے نکل آیا تھا۔

بہت خوب۔ آج کل نوجوانوں کو اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے صحت کے لئے چہل قدمی ضروری ہے ہاں تو ثمینہ تم نے کبھی پہلے ان کا ذکر

نہیں کیا۔ چلو خیر اب ملاقات ہو گئی یہ بھی اچھا ہوا۔ انھیں کبھی چائے پر بلاؤ میرا خیال ہے بلانے کی ضرورت ہی نہیں اب اکٹھے چلتے ہیں۔ ایک تو کوٹھی دیکھ لیں گے دوسرے تھوڑی دیر گپ رہے گی۔ کیوں مسٹر پرویز آپ کا کیا خیال ہے۔

ضیا نے پوچھا۔

جی ـ میں ....

بھئی چھوڑو ان بہانوں کو میں کچھ سننے کو تیار نہیں

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں" ـــ شاید یہ کہیں ضروری کام سے جا رہے ہوں۔

ثمینہ بولی۔

میں تو اس سے جدا ہونے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن اس کے کہنے پر مجھے بہانہ بنانا پڑا۔

"جی مجھے اب ایک بہت ضروری کام ہے۔ پھر حاضر ہو جاؤں گا۔

یہ سب ٹھیک ہے۔ اگر تم لوگ نہیں مانتے۔ تو خیر آج شام کو ہی آجائیے، یہ لو میرا کارڈ۔ اس میں گھر کا پتہ چھپا ہوا ہے ـــ دیکھئے بھولئے گا نہیں۔

چلو چلیں ضیا صاحب۔

ثمینہ بولی۔

اچھا بھئی پرویز صاحب پھر شام کو ملاقات ہو رہی ہے۔

"ہاں"

میں نے بڑی مشکل سے الفاظ ادا کئے۔

خدا حافظ

اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

میں نے محسوس کیا۔ کہ ثمینہ مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہے، اس کی آنکھوں میں اشک چھپے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بار کچھ ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ کہ میرا دل تڑپ گیا۔ جیسے کوئی تڑپتا ہوا پنچھی رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا ہو۔

وہ قریب ہی کھڑی ہوئی ایک خوبصورت کار میں بیٹھ گئے۔ اور چلے گئے میں کافی دیر تک کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ میں نے اس پر کیوں اعتبار کیا۔ عورت ہمیشہ بے وفا ثابت ہوئی ہے۔ اس کا ایک ایک واقعہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ کیا وہ وعدے محض وقتی تھے۔ اور شادی کی کسی کو خبر نہیں کی۔ اور وہ حضرت کیسی بے تکلفی سے مجھے دعوت دے رہے ہیں۔ ثمینہ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ بے وفا کہیں کی، کتنی جلدی اسے کہہ رہی تھی۔ پھر کتنی جلدی کام کا بہانہ کر دیا۔

میں دانت پیس رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ اگر اب وہ میرے ہاتھ لگ جائے۔ تو میں اس کا گلا دبا دوں۔ میں قریب کے ایک ہوٹل میں جا بیٹھا چائے منگوائی۔ لیکن دل بہت اچاٹ تھا۔ وہاں کے شور سے گھبرا گیا۔ ریڈیو پر فلم کے فلمی گانے ہو رہے تھے۔ اور تمام میزیں اٹی پڑی تھیں۔ جلدی سے باہر آ گیا۔ اور گھر کی جانب چلا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ ہوا بھی قدرے تیزی اختیار کر گئی تھی۔ اس میں خنکی کو کافی دخل تھا۔ میرے دل میں ایک آگ سلگ رہی تھی۔ بوندیں اور تیز ہو گئیں۔ اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی، لیکن میں چلتا رہا اپنی دھن میں۔ بالکل بارش سے بے خبر۔

جب میں گھر پہنچا تو پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک پھریری سی آئی۔ پاؤں سے جوتا نکالا۔ جو پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ اور چھوٹی میز کو نزدیک گھسیٹا اس پر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔ پتلون سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر فرش گیلا کر رہے تھے۔ قمیض اور بالوں سے گرنے والی بوندیں کرسی کو تر کر رہی تھیں، میں نے ہاتھ سے سر کے بالوں کو صاف کیا اور گیلے ہاتھ سے کرسی کے بازوؤں سے پونچھ کر پتلون کی جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا۔ وہ بھی بھیگ چکا تھا۔ پھر اسے کھول کر سگرٹ نکالا۔ اور منہ میں دبا کر ماچس جلانے لگا۔ لیکن وہ جلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ تمام دیا سلائیاں ختم ہو گئیں لیکن سگرٹ نہ سلگا سکا۔ میں نے منہ سے سگرٹ نکال کر اسے غور سے دیکھا۔ اور مٹھی میں لے کر اسے مسل ڈالا۔ اور باہر پھینک دیا۔ اس کا تمباکو باہر پانی کی سطح پر تیرنے لگا۔

میں ثمینہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کپڑے ذرا خشک ہو چکے تھے۔ شاید وہ مجھے بھول چکی ہے۔ کہیں اس نے میری یاد کو دل و دماغ سے اس طرح خارج تو نہیں کر دیا۔ جس طرح ایک نئی دلہن شادی کے چند مہینوں کے بعد اپنا لال جوڑا اتار پھینکتی ہے۔ وہ ہنستی ہوئی اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی۔ پھر اس کا خاوند کچھ زیادہ خوبصورت تو نہیں ہے، اور پھر وہ مجھ سے زیادہ خوش شکل نہیں۔ پھر بھی وہ اس سے کس قدر خوش ہے وہ بوڑھا کھوسٹ، اور ثمینہ ایک اٹھتی مدھر جوانی، جو آگ ہے سراپا آگ، اور وہ بوڑھا بھلا اس آگ کو ٹھنڈا کر تاکیا جانے، لیکن وہ امیر تو ہے، پیسہ سب کچھ ہے، وہ آگ تو ٹھنڈی کرنے کی بجائے سرے سے بجھا دیتا ہے۔

"میں اکیلا ہوں۔ بالکل اکیلا۔ دن رات وہی منظر میری آنکھوں میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔ لیکن میں اس منظر سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بس ایک یاد ہے جو اکثر ستاتی رہتی ہے۔ اب حالت یہ ہے۔ کہ نہ تو میں محبت کر سکتا ہوں۔ کیونکہ ڈینی نے مجھ سے جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا۔ اور نہ شادی کر سکتا ہوں۔ کیونکہ میں نے تمہارے ساتھ شادی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اب صرف تمہاری طرف خیال رہتا ہے۔"

میں یہ باتیں یوں کہہ گیا۔ جیسے میں اس سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

بارش ختم ہو چکی تھی۔ گھڑی کی جانب دیکھا، تین بج چکے تھے — میں جلدی سے اٹھا اور الماری سے کپڑے نکالے۔ ایک ایک کو دیکھا جانچا۔ اور پھر ایک اچھا سا جوڑا منتخب کیا، منہ دھو کر کپڑے بدلے ثمینہ کے ہاں جانے کا ارادہ کیا دروازے کے قریب آکر رک گیا۔

" مجھے وہاں نہیں جانا چاہیئے۔

میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا "

"کہیں اس کے خاوند کو ہمارے تعلقات کا علم نہ ہو جائے۔ ورنہ ثمینہ کی زندگی خراب ہو جائیگی، شاید وہ اسی لئے ضیا کو وہاں سے جلد چلنے کیلئے مجبور کر رہی تھی "

" لیکن انہوں نے مجھے خود دعوت دی ہے۔ شاید وہ جلدی میں ہوں۔ اور پھر ضیا نے کس قدر زور دیا تھا۔ وہ لوگ میرا انتظار نہ کر رہے ہوں۔ مجھے ضرور جانا چاہیئے " میرے دل نے کہا۔

میں جلدی سے باہر آ گیا، کہیں مجھے پھر نہ رکنا پڑے، اور میں تیز تیز قدموں سے ان کی کوٹھی کی جانب چل پڑا۔ میرا دماغ بالکل خالی تھا کیونکہ اب میں کچھ اور سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

میں ایک خوبصورت دو منزلہ کوٹھی کے سامنے کھڑا تھا جس کے آگے ایک خوبصورت لان بھی تھا جس میں جابجا پھول کھلے ہوئے تھے۔

"یہی چیز ثمینہ کو مجھ سے دور لے گئی ہے " لیکن وہ اس قدر کمزور کیوں ہو چکی ہے۔ اس کی وہ خوبصورتی کہاں گئی۔ وہ سب کچھ کیا ہوا۔ جیسے مجھے بیتاب کر دیا تھا۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں۔ اور اس رات ضیا ڈاکٹر کی باتیں جو کر رہا تھا۔ وہ ضرور بیمار ہے "

میں سوچنے لگا۔

میں نے دروازے کے قریب جا کر بیل کا سوئچ دبایا، اندر سے گھنٹی کے بجنے کی آواز سنائی دی اور پھر قدموں کی چاپ قریب ہوتی گئی۔ دروازہ کھلا میرے سامنے ضیا کھڑا تھا۔

" ہیلو مسٹر پرویز۔ تم آ ہی گئے نا۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

rekhta

بہت خوب۔ بہت اچھا کیا آپ نے۔ میں ابھی ابھی ثمینہ سے تمہارا ہی ذکر کر رہا تھا۔ اوہ آپ ابھی تک باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر آجاؤ نہ بھئی آپ تو گھبرا رہے ہیں۔ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو آؤ۔

وہ مجھے ایک سجے ہوئے کمرے میں لے گیا۔ میں نے کھڑے کھڑے تمام کمرے کا جائزہ لیا۔ عمدہ فرنیچر۔ اعلیٰ قسم کے قالین۔ دیواروں پر قسم قسم کی تصویریاں۔ سب چیزوں سے ہوتی ہوئی میری نظریں ایک میز پر جا کر رک گئیں۔

"ثمینہ"

میرے منہ سے بھونے سے نکلا۔ ثمینہ کی تصویر میز پر پڑی تھی۔ وہ ثمینہ جو آج سے کئی ماہ پیشتر مجھے ملی تھی۔ کل والی ثمینہ سے بالکل مختلف وہی مسکراتے ہوئے پتلے پتلے خوبصورت ہونٹ وہ چمکتی ہوئی آنکھیں۔ بھرے بھرے گال سب کچھ وہی۔

"تشریف رکھیے" مسٹر پرویز"

ضیا کی آواز سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ اور ایک صوفہ پر بیٹھ گیا لیکن نگاہیں وہیں مرکوز تھیں۔ اور خیال بھی۔

"سگرٹ لیجئے"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ تو ضیا مسکرا رہا تھا۔ اور اس نے سگرٹ کا پیکٹ میری جانب بڑھایا ہوا تھا۔ میں نے سگرٹ لیا۔ تو ضیا نے ماچس جلا کر میرا سگرٹ سلگایا۔ اور ماچس بجھاتے ہوئے بولا۔

"معاف کرنا۔ میں ذرا ثمینہ کو بھی اطلاع کر دوں"

وہ اٹھا اور اندر چلا گیا۔ میں نے کمرے کا ایک بار پھر سے جائزہ لیا اور میری نظریں پھر سے اسی تصویر پر آ جمیں۔

"ثمینہ — بھئی مسٹر پرویز آئے ہیں"

مجھے اندر سے سنائی دیا

میرے کان ثمینہ کی آواز سننے کے لئے بیتاب ہو گئے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر مجھے دوسرے کمرے سے کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ذرا اور توجہ سے سنا۔

"ثمینہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم آخر اس بات کو سمجھتی کیوں نہیں"

ضیا کی آواز سنائی دی۔

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں"

یہ ثمینہ کی آواز تھی

"یہ تم بچوں کی سی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ میں تمہاری یہ حالت میں دیکھ سکتا خدارا کچھ تو خیال کرو"

"آپ یہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں۔ اور میں بھلا ....."

"یہ ٹھیک ہے۔ وہ تمہارا دوست ہے بچپن کا ساتھی بھی"

"سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن اب میں آپ کی بیوی ہوں"

"تو پھر میری بات پر دھیان کیوں نہیں دیتی۔

"آپ کچھ سوچئے تو سہی"

"میں سب کچھ سوچ چکا ہوں"

میں ان کی یہ باتیں سمجھ نہ پایا تھا۔ وہ اسی طرح آپس میں جھگڑ رہے تھے اور میں اس کمرے میں گم سم بیٹھا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر مجھے ضیا کی آواز صاف سنائی دی۔

"بھئی ثمینہ یہ کام پھر ہوتے رہیں گے۔ وہ بے چارے کب سے انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں چلو میں بھی آتا ہوں۔"

تھوڑی دیر کے بعد ثمینہ اندر آئی۔ میں نے ایک بار اس کی جانب دیکھا۔ نظریں ملیں۔ اور وہ نظریں جھکا کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے"

میں نے یوں ہی پوچھ لیا

"ٹھیک ہوں"

وہ بولی۔

میں اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ بدستور نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ آج وہ بہت ہی کمزور نظر آ رہی تھی۔ چہرے کا رنگ اور پیلا ہو چکا تھا۔ اور آنکھیں بے جان تھیں۔ آنکھوں کے نچلے حصے میں اور زیادہ سیاہی پھیل چکی تھی

"ثمینہ"

میرے ہونٹ ہلے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور میری سانس تیز تیز چلنے لگی۔ میرا دل چاہتا تھا۔ کہ سب کچھ اس سے کہہ دوں۔ جو میرے دل میں ایک عرصہ سے لاوا کی مانند اندر ہی اندر ابل رہا ہے۔ جس نے میرے چین و قرار چھین لیا ہے۔ میری راتوں کی نیند کو مجھ سے دور لے گیا ہے۔ میں اس سے اس کی بے وفائی کا گلہ کروں گا۔ اس نے میری پیاس کو اور زیادہ بھڑکا دیا جب میں پانی پینے لگا۔ تو گلاس ہونٹوں سے علیحدہ کر دیا۔ مجھے منزل کو لالچ دے کر راستے میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔

یہ سب کچھ اس نے کیوں کیا۔ اس نے یہ سزا کس جرم کے پاداش میں دی میں یہ سب کچھ اس سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ لیکن میری زبان.....

میرا ساتھ نہ دے سکی۔

میں نے جیب سے سگرٹ نکالا۔ اور اسے سلگا کر اس کے کثیف دھوئیں میں کھو جانا چاہا۔ میں تمام باتیں بھول جانا چاہتا تھا۔ لیکن ثمینہ کی موجودگی نے میرے جذبات پر انگیخت کر دیئے۔ میں نے ایک زور کا کش لیا۔ سگرٹ کا دھواں حلق سے اندر چلا گیا۔ مجھ میں کھانسی کا ایک شدید دورہ پڑا۔ کھانستے کھانستے میری آنکھوں سے پانی نکل آیا۔ جب تھوڑی دیر کے لئے چین پڑا۔ تو میں نے ثمینہ کی جانب دیکھا۔ وہ ہمدردانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اشک ابل رہے تھے۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر آنکھوں کو صاف کیا۔ اور ایک بار پھر اس نے غور سے دیکھا۔ اٹھی ہوئی نظریں پھر سے جھک گئیں۔

"بھئی آپ تو چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ کوئی لڑائی وڑائی تو نہیں ہو گئی بھئی بچپن کی زندگی بھی عجیب زندگی ہوتی ہے۔ اور پھر بچپن کے ساتھی۔ جنہیں انسان کبھی نہیں بھول سکتا"

ضیا نے اندر آ کر ہم دونوں کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں"

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"بھئی مجھے یقین نہیں آ رہا"

"مجھے تو کچھ علم نہیں البتہ ان سے پوچھ لیں۔ شاید انہیں کچھ پتہ ہو"

میں نے ثمینہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ثمینہ تم ہی کچھ بتاؤ"

"کچھ نہیں"

وہ ٹیڑھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہاں آؤ میرے قریب۔ اٹھو تاکہ تم دونوں کی صلح کرا دوں۔ شاید تم دونوں کو کچھ یاد نہ ہو"

ضیا نے ثمینہ کو بلاتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھی۔ اور ضیا کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ضیا نے اس کے بازو کو پکڑ کر میرے قریب لا کر بٹھا لیا اور خود سامنے کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ کافی پرتکلف چائے تھی۔ چائے کے دوران میں کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ لیکن ضیا مجھے کھانے کے لئے بار بار تقاضا کرتا رہا۔

چائے پی چکنے کے بعد وہ اٹھا۔ اور۔ بولا۔

"معاف کیجئے گا پرویز صاحب۔ مجھے ایک جگہ جانا ہے۔ میں نے پانچ بجے ایک صاحب سے ملنا ہے"

"تو میں بھی چلتا ہوں"

میں اٹھتے ہوئے بولا۔

"ہا۔ ہا۔ نہ۔ نہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ بیٹھئے نا۔ ثمینہ جو ہے۔ بھئی باتیں کرو۔ میں بھی جلد آ جاؤں گا۔ دیکھئے میرے آنے تک جائیے گا نہیں۔ بلکہ شام کو کھانا اکٹھے کھائیں گے دیکھو ثمینہ پرویز صاحب کو جانے نہیں دینا۔ بھئی تمہارا بھی تو ان پر کچھ حق ہے۔ آخر بچپن جو ساتھ گزرا ہے اور یہ خیال رہے کہ ای طرح ادھار کھائے نہ بیٹھے رہنا۔ آخر یہ بے چارے بور ہو جائیں گے۔ اور بھاگنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اچھا پرویز صاحب چیریو" وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ ثمینہ مجھ سے اس قدر قریب ہے۔ میرے دل کی اب عجیب حالت تھی۔ جیسے وہ اچھل کر باہر آ گرے گا۔ میں نے ایک بار چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں ہمارے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ میں ثمینہ کی جانب دیکھا۔

وہ یونہی فرش کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے سگرٹ نکال کر سلگایا اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔

"ثمینہ"

میں نے دھڑکتے دل اور پھڑکتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

اس نے میری جانب کنکھیوں سے دیکھا۔ اس کے ہونٹ کھلے تھے لیکن کوئی آواز ان سے نہ نکلی

"مجھ سے ناراض ہو گیا"

میں نے پھر پوچھا

"نہیں تو ——"

"پھر مجھ سے اتنی دور کیوں ہو"

"میں بالکل قریب ہوں"

"اور قریب آ جاؤ۔ "ثمینہ تم کیا جانو کہ میں نے تمہارے بغیر کس حالت میں یہ دن کاٹے ہیں۔ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ اور پھر تم نے مجھ سے شادی کا ذکر بھی نہیں کیا۔ میں تو ایک پروگرام بنا چکا تھا کہ تمہیں اپنا لوں گا اور پھر میں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔ ڈینی نے مجھے تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں نے تمہیں دن کے اجالے اور راتوں کے اندھیارے میں ڈھونڈا لیکن تم نہ جانے کہاں چھپی رہیں۔ اور پھر تم کو اس وقت پایا جب تم کسی کی بن چکی تھی۔ اور آج میں تمہارے لئے اجنبی ہوں —— ثمینہ۔ شاید تمہیں وہ دن یاد ہوں گے۔ جب میرے ایک اشارے پر تمہارے

مجھے اپنی چھاؤں میں لے لیتے تھے۔ اور پھر ہم سب کچھ بھول کر ایک نئی دنیا میں کھو جاتے تھے۔ ایک انجانی دنیا میں "

میں نے دیکھا۔ کہ اس کی آنکھوں سے اشک بہہ نکلے ہیں۔ اور وہ آنکھیں بند کر کے انہیں پلکوں میں جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں۔

میں اس کے قریب کھسک گیا۔ اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ بند آنکھیں ایک مرتبہ کھلیں اور پھر بند ہو گئیں۔ اس کا سر میرے کندھے پر آن ٹکا اور پھڑکتے ہوئے آنسو یکبارگی بہہ نکلے جس طرح سیلاب کا پانی کوئی بند توڑ کر نکل پڑے۔

" ثمینہ مت روؤ ۔۔ ثمینہ "

میں نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔ اور اسے اپنے منہ سے بالکل قریب لا کر رک گیا اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ اور ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ جیسے ذبح کے وقت بکرا تڑپتا ہے۔ میرے جذبات کا دھارا بہہ نکلا۔ مجھ میں ضبط کی طاقت چھن گئی۔ میں ایک رو میں بہتا چلا گیا۔ میرے ہونٹ آگے بڑھے۔ اور اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں سے مل گئے ۔۔۔ دو مختلف سلگتی ہوئی لکڑیاں مل کر ایک الاؤ کی صورت اختیار کر گئیں ۔۔۔ دریا سے دریا مل کر سمندر بن گیا۔ اور ہم دونوں اس الاؤ میں جلنے لگے۔ اس سمندر میں ڈوبنے لگے۔

" ثمینہ۔ تم اپنے بالوں کو کھول دو۔ آج میں پھر وہی منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ جس کی یاد اب تک میرے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے "

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے بال کھول دیئے۔ اور میں صوفے پر لیٹ گیا۔ اس کی ران میرا تکیہ تھی۔ اور میں اس کے بالوں کے سائے میں اسی دنیا پہنچ گیا جس کے لئے میں تڑپتا رہتا تھا۔ جس دنیا کے بارے میں سوچ کر نہ جانے میرے دل میں ایک گدگدی سی کیوں ہونے لگتی تھی۔

پھر یہ الاؤ بڑھتا گیا۔ یہ سمندر پھیلتا گیا۔ اور ہم اس میں بالکل گھر گئے۔ اور اس میں لرزتے چلے گئے۔ اور میں نے اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ اور قریب پڑے ہوئے پلنگ پر لے گیا۔

اب یہ الاؤ بالکل اس دنیا کو ہی اپنے گھیرے میں لے چکا تھا۔ میں جذبات کی رو میں بہتا ہوا نہ جانے یہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔

ثمینہ میرے قریب پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ اور میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے سکون سے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ہونٹ ساکن۔ یوں جیسے ایک کم سن بچے کو تھپک تھپک کر سلا دیا گیا ہو۔

مجھے ضیا کا خیال آیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے باہر گیا تھا۔ کہیں وہ آ نہ جائے اور ہمیں اس حالت میں دیکھ کر کیا سوچے۔ وہ تو ہمیں اس لئے اکیلا میں چھوڑ گیا تھا۔ کیونکہ وہ ہم دونوں کو بچپن کے ساتھی سمجھتا تھا۔ اور میں نے اس کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ میرے آنکھوں کے سامنے اس کا چہرہ گھوم گیا۔ اور میں فوراً وہاں سے اٹھ گیا۔ ثمینہ بدستور لیٹی ہوئی تھی۔

" ثمینہ ۔۔ اٹھو۔ ثمینہ کوئی آ نہ جائے "

میں نے اسے ہلاتے ہوئے کہا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک

تھی۔ اس نے چند ساعت کے لئے میری جانب دیکھا۔ اور مسکرا کر آنکھیں پھیر لیں۔ اور بولی۔

"یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔"

میں صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ میں اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا میں نے سگرٹ نکال کر سلگایا۔ اور مزے سے دھواں اڑانے لگا ثمینہ تھوڑی دیر کے بعد اٹھی۔ اس نے کپڑوں کو درست کیا۔ اور جلدی سے اندر چلی گئی۔

میں تھوڑی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ پھر ضیا کا خیال ذہن میں آیا، وہ آرہا ہوگا، میں اس سے کس طرح بات کر سکوں گا، اگر اسے پتہ چل گیا تو؟۔

میں اٹھا اور ثمینہ کو بتائے بغیر وہاں سے نکل آیا۔

میں ثمینہ کے ہاں سے سیدھا گھر آگیا۔ مجھے اس دن نہ جانے کیوں یک گونا مسرت سی محسوس ہو رہی تھی میں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے مجھ پر سے بہت سا بوجھ اتار دیا گیا ہو۔ میرے بدن میں چستی کی لہر سی دوڑ چکی تھی۔ میرا انگ انگ سکون محسوس کر رہا تھا۔ اور میرا دل ٹھہرے ہوئے اس ساکن سمندر کی مانند تھا جو طوفان کے گزرنے کے بعد بالکل ساکن ہو گیا ہو۔ دل کے ارمان بھی پورے ہو چکے تھے۔ تمنائیں بھی آچکی تھیں۔ جس امید کے سہارے پر اس وقت تک زندہ تھا۔ وہ پوری ہو گئی تھی۔ میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ جیسے قارون کا خزانہ مجھے مل گیا ہو۔

میں اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹنے کے انداز میں بیٹھا تھا، پاؤں سامنے کھلی کھڑکی پر پسارے ہوئے تھے۔ اور میں سگرٹ دبائے لمبے لمبے کش لے کر سامنے خلا میں کچھ دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی

rekhta

آسمان پر پھیلے ہوئے سائے آنکھوں کو بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ ان پر پھیلی ہوئی ڈوبتے سورج کی کرنیں کچھ عجیب سا منظر پیش کر رہی تھیں۔ کہیں کہیں بادل کا کوئی سفید ٹکڑا آسمان پر ساکن معلوم ہو رہا تھا۔ بالکل اس بستر کی مانند جس پر تھوڑی دیر پیشتر ثمینہ کے ساتھ تھا۔ فلک پر لالی پھیلنے لگی۔ اور میری آنکھوں میں اس سفید چادر پر پڑے ہوئے لال دھبے پھیل گئے۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آسمان پر لالی بدستور تھی۔ اور اس وقت وہ سفید بادلوں کے ٹکڑے لال چادر سفید دھبے معلوم ہو رہے تھے۔

"سفید — لال — دھبے — دھبے"

دھبے پھیلنے لگے۔ اور انہوں نے میرے دماغ کو بالکل ماؤف کر دیا میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اور میں اس پر جس قدر غور کر رہا تھا۔ یوں یوں وہ دھبے میرے دل پر نقش ہو رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے۔ لال سفید نیلے پیلے۔ کئی قسم کے دھبے ناچنے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ ان میں اس کا کوئی حل تلاش نہ کر سکا۔ اور وہ دھبے میرے ذہن میں گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی میں ان کے بارے میں سوچتا رہا۔

"ضیا ثمینہ کا خاوند نہیں ہے کیا؟"

"وہ تو خود اسے اپنا خاوند کہہ رہی تھی"

"پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے"

"پھر وہ ویسے کیونکر"

"کہیں ضیا ....."

نہیں، نہیں۔ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے جو سوچا غلط سوچا۔ ثمینہ ضیا کی بیوی ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی ہیں، — لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ..... دھبے ..... کیسے اور کیونکر .....

میں نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ اس کے باوجود میں کچھ بھی نہ سوچ سکا —

آسمان پر تاریکی کا جال پھیل چکا تھا۔ اور کمرے میں اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ لیکن میں گزرے ہوئے چند لمحات کی یادوں میں بسا سگرٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اندھیرے میں چاند کی ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی تھی۔ کمرے میں بھی کھڑکی کے راستے چند کرنیں آ گئی تھیں۔ میں نے جلتے ہوئے سگرٹ کی جانب دیکھا۔ اس کے سرے پر چمکتی ہوئی آگ جگنو کی مانند تھی۔ لیکن اس میں سے نکلتا ہوا دھواں نظر نہیں آ رہا تھا، بلکہ آنکھوں سے محسوس کیا جا رہا تھا۔

میں نے سگرٹ کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اور کرسی سے اٹھ کر کھڑکی پر کہنیاں ٹیک کر باہر کی جانب دیکھنے لگا۔ چاند ابھی نامکمل تھا میں ٹکٹکی باندھ کر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ نیلے آسمان پر چاند نی پھیلی ہوئی تھی اور کہیں کہیں ستارے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ستارے بھی بالکل دھبے ۔.....

"اف میں یہ سب کچھ کیا سوچ رہا ہوں"

میں نے جھرجھری لے کر اپنے آپ سے کہا۔

میں نے کھڑکی بند کر دی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا ہو گیا۔ میں ٹٹولتے کے

رات بھر میں ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتا رہا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ثمینہ میرے ساتھ ہے۔ میں اسے محسوس کر رہا۔ چھو رہا۔ اس کے بدن کا لمس ہے۔ اس کی گلاب کی پنکھڑیوں کے سے ہونٹ ہیں۔ اس کی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک ہے۔ چہرے پر تازگی ہی تازگی ہے، وہ مسکرا رہی ہے۔ میں مسکراتا ہوں۔ زندگی مسکراتی چلی جاتی ہے۔ وہ مسکرا کر میری بغل میں آجاتی ہے۔ میں اسے بھینچتا ہوا۔ اسے اپنے آپ میں جذب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

دن بھر میں گھر سے باہر نہ نکلا۔ کئی بار سوچا۔ کہ ثمینہ کے ہاں جاؤں لیکن ضیا کے بارے میں سوچ کر رک جاتا تھا۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا۔ مجھے تو وہ ایک شریف آدمی سمجھتا تھا جبھی تو وہ مجھے اکیلے میں اپنی بیوی کے ساتھ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں اس کا مجرم ہوا۔ میں نے اس کی امانت میں خیانت کی ہے میں نے اس کے اعتبار کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ میں اس سے آنکھیں کس طرح ملا سکوں گا۔ لیکن خوب — ایک ادھیڑ عمر کا شخص ایک نوجوان لڑکی سے شادی کرے۔ محض دکھاوے کے لیے۔ اپنی ہوس کے لیے، لیکن اس کی ذمہ داری اپنے کمزور کندھوں پر نہ اٹھا سکے۔

میرا تخیل عجیب ویرانوں میں بھٹکنے لگا تھا۔ ثمینہ کے رومان کے وہ دن جوانی کے وہ رنگ محل، شادی سے پیشتر وہ چاہنے۔ اور چاہے جانے کی آرزوئیں کیا اس بوڑھے نے کبھی عشق کا ایک لفظ بھی کہا ہوگا۔ جو برف تھا کبھی اس نے شدت اور حرارت کے ساتھ ان نقوش کو چوما ہوگا۔ اس کی چاہت میں ابھی بھری ہونگی۔ تیز کی سکراہٹیں۔ اس کی محبت اس کی

اور اس کی آنکھوں کی چمک ضرور ماند پڑ چکی تھیں۔ یہ سب کچھ اس بوڑھے کھوسٹ کا قصور ہے۔ جو اس کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن زمانے کی نظر میں اس کا سب کچھ ہے۔

"نہیں۔ نہیں۔ مجھے یہ سوچنا نہیں چاہیئے۔ ثمینہ ضیا سے خوش ہے یہ تمام میری غلط فہمیوں کا نتیجہ ہیں۔ پھر بھی ثمینہ اس کی بیوی ہے۔

شام ہو چکی تھی۔ دن بھر کی مسافت کے بعد تھکا ہوا سورج اپنا رخت سفر لپیٹ رہا تھا۔ مغرب میں کسی پناہ گاہ میں آرام کرنے کے لئے بے قرار تھا۔ بچے سکولوں سے واپس آجانے کے بعد سامنے گلی میں جمع ہو کر شور مچا رہے تھے۔ میں ان کے شور سے تنگ آکر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دل سخت بے قرار تھا۔

سڑک پر کافی چہل پہل تھی۔ لیکن میں اس بھیڑ سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں ابھی تک یہ فیصلہ کر نہیں پایا تھا۔ کہ اب مجھے ثمینہ سے ملنا چاہیئے یا نہیں۔

میں مال روڈ کے ایک سینما میں جا کر یونہی تصویریں دیکھنے لگا۔ لوفیہ لورین کی نئی تصویر چل رہی تھی۔ اور میں نے جب سے اس کی فلم دیکھی تھی مجھے اس کی ہر فلم دیکھنے کی تمنا تھی اور پھر اس دن کاسٹ میں اس کا نام پڑھ کر نہ جانے میں غور سے تصویریں دیکھنے لگا۔

میں نے محسوس کیا جیسے میرے قریب آکر کوئی رکا ہو۔ میں نے نظریں گھما کر دیکھا۔ تو میرے سامنے نائنٹی نائین کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔

اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک شوخ اور دل آویز لہجے کے ساتھ پوچھا۔

"آپ پھر کالج نہیں آئے۔ کیا ڈینی سے دل بھر گیا"

میں ان نظروں کو پہچان گیا تھا۔ ان حربوں سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا کہ حسن اپنے حربوں پر کیا غرور کرتا ہے۔

"اس دن کے بعد تو نہیں آیا۔ لیکن اب آیا کروں گا۔ ڈینی سے نہیں آپ سے ملنے کے لئے صرف آپ سے"

اس کا چہرہ آب آب ہو گیا تھا، وہ سامنے آکاش پر کھیلتی شفق کی طرح لفظ ڈھونڈتی رہی اور نہ پا سکی۔

پھر قدرے سکوت کے بعد بولی

"پکچر دیکھنے کا ارادہ ہے کیا"

"اگر آپ دعوت دیں تو"

میں نے اس کی جانب جھکتے ہوئے کہا

میں..... میں.....

وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

"ٹکٹ میں خرید لیتا ہوں۔ بس آپ کی رفاقت ہی کافی ہے"

میں نے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے کہا

وہ کچھ نہ بولی۔ بلکہ اس کی عینک میں چمکتی ہوئی آنکھیں اور زیادہ پھیل گئیں۔ میں نے ایک باکس ریزرو کرا لیا۔ اور اس کے قریب آکر کہا،

"چلیئے۔ تشریف لے چلیئے۔"

وہ ذرا ہچکچائی۔ اور میرے ساتھ چل پڑی۔ جب ہم باکس کے قریب پہنچے، تو وہ جھجکی، اور بولی۔

"ہم دونوں ہی ہونگے"

"ہاں۔ ہاں۔ کیا حرج ہے"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

ہال میں کوئی زیادہ رش نہیں تھا۔ لیکن کچھ لوگ آ رہے تھے میں نے ہال سے نظریں گھما کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ سامنے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

یہ عورتیں بھی عجیب مخلوق ہے۔ وہ یہ جانتے ہوئے کہ یہاں جال بچھا ہوا ہے۔ خود بخود اس میں آن گرتی ہے۔

"آج تو آپ نے ایک فیصدی ہنسنا بھی چھوڑ دیا"

میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو"

وہ پھر مسکرائی۔

"یوں۔ یہ بات ہوئی نا"

میں نے اس کے کندھے سے اپنا کندھا ملاتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ گھبرائی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ محرومی انگلیاں لمبی پتلی ناگن کی طرح بل کھاتی لہراتی، وہ ناخن جن پر ہلکا سا احمر کا رنگ جھلک رہا تھا، اور وہ ہتھیلی جس پر کنول کا شبہ ہوتا تھا۔ میں بڑی جوانیت سے اسے دونوں ہاتھوں میں مسل رہا تھا،

اس کے منہ سے ہلکی سی "آہ" نکلی۔ اور صوفے سے قدرے اٹھی میں نے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اور وہ پھر سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں شکایت بھری ہوئی تھی۔

فلم شروع ہو چکی تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے پوچھا۔

"آپ کا نام"

"گلنار" وہ آہستہ سے بولی۔

بہت پیارا نام ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔

اور پھر میں نے نہ جانے کتنے بوسے اس کے خوبصورت ہاتھ کے لئے میں سوچنے لگا تھا۔ کہ آج تک نہ جانے کیوں لوگ عورتوں کی تجارت کرتے رہے ہیں۔ اس کی زندگی محض انسان کی جنسواتی بھوک کو پورا کرتے گزر جاتی ہے، اور پھر گلنار کا گداز جسم، آنکھوں کی چمک، اور خوبصورتی بھی اس کی نذر ہو جائے گی۔ اسی طرح جس طرح کے وہ میرے ساتھ مگر وہ بیوقوف سمجھی کہ میں اس سے اظہار محبت کر رہا ہوں۔

اس کا سر میرے کندھے پر ٹکا ہوا تھا۔ اور زلفیں پریشان تھیں میں اس کے چہرے کی لکیروں کو حرکت کرتے دیکھ رہا تھا وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں، لمبے لمبے کالے بال۔ دلکش ابرو۔ حسن کے خدوخال کیسے مانوس کیسے ناآشنا ہیں۔ میں نے اس کے تمتماتے ہوئے گال ہاتھوں میں تھام رکھے تھے۔ اور اس کا گلنار چہرہ میرے قابو میں تھا۔

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں"

اس کے ہونٹ ہلے

"ہاں۔ بہت ۔۔۔ بہت زیادہ"

میں نے یہ الفاظ یوں ادا کئے جیسے مجھ پر خمار کا سا اثر ہو۔

"لیکن ڈیڈی سے کیوں ملتے ہیں آپ؛"

"دیو نہی اس سے جان پہچان ہے"

میں نے یونہی اس سے کہہ دیا۔

"آپ مجھے اپنی محبت کا یقین دلا دیجئے۔ اور وعدہ کیجئے کہ آپ ڈیڈی سے نہیں ملیں گے"

"میں پہلے بھی تو نہیں ملتا تھا"

"اس کا مطلب ہے۔ کہ تمہیں میری محبت کا یقین نہیں۔ یعنی تمہیں اپنی محبت کا بھی یقین نہیں"

میں نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو اب بھی میری محبت پر اعتبار نہیں۔ میں جس نے کہ اپنا سب کچھ آپ کے حوالے کر دیا۔ میں آپ کی ہوں۔ میرا دل، میرا دماغ غرض کہ میں سراپا آپ کی ہوں

اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں نے اس کی عینک کو ہٹا کر رومال سے آنکھیں خشک کیں۔ اور کہا۔

"پگلی"

ایک ہلکا سا تبسم۔ ایک موج حیا۔ ایک نگاہ دل نواز۔

فلم ختم ہو چکی تھی۔ ہال خالی ہو چکا تھا، ہم بھی باہر آ گئے۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ سامنے کی گھڑی میں نو بج چکے تھے، اس وقت تک میرے دل و دماغ پر ایک نشہ سا طاری تھا۔ گلنار میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے کپڑوں سے آنے والی بھینی بھینی خوشبو اب تک میرے دماغ میں بسی ہوئی تھی۔

ہم باتیں کرتے کرتے ان کے ہوسٹل کے قریب آ چکے تھے۔ فلم کے بارے میں۔ لیکن میں فلم دیکھ بھی نہ سکا تھا۔

"اب آپ جائیے۔ کوئی دیکھ نہ لے"

وہ ڈرتے ڈرتے بولی، اور اس کی نظروں ..... کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"پھر کب ملاقات ہوگی"

"خدا حافظ"

وہ جلدی سے لمبے لمبے قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی۔ اور میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا جب وہ ہوسٹل کے اندر چلی گئی۔ تو میں گھر کی جانب چل پڑا۔ میرے دماغ میں تھا۔ شمینہ نہ سہی گلنار ہی سہی۔

میں گلنار سے ہر روز ملنے کے لئے چلا جاتا تھا۔ پھر ہم وہاں سے کسی تفریح گاہ کی جانب نکل جاتے تھے۔ میں اس کے لئے تفریح کا باعث بنتا تھا۔ اور وہ میرے لئے۔ اور میں گلنار کی رفاقت میں شمینہ کو بھولتا جا رہا تھا۔ جب کبھی وہ یاد آتی تھی تو میں اسے بھلانے کے لئے گلنار کی شکل کو آنکھوں کے سامنے لانے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔

ایک ہفتے کی رات کو گلنار کے ساتھ میں دریائے راوی پر گیا ہم دونوں نے کشتی کی۔ میں نے گلنار کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اور کشتی کھیتا ہوا دریا کے درمیان لے گیا۔ چاندنی رات تھی۔ سامنے درختوں میں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی دل کو لبھا رہی تھی۔ عجیب سماں تھا۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی پھر دور سے کسی دیہاتی کے گانے کی تان سنائی دی۔ جو بڑے اچھے سر میں گا رہا تھا۔ میرے سر میں پنجاب کی ایک

انیلی نار جس نے محبت کے آگے اپنی موت کو جھکا دیا۔ لیکن اس کی محبت جوں کی توں رہی۔ اور آج اتنے سال گذر جانے کے بعد بھی اس کی یاد لوگوں کے دلوں میں بسی ہوئی ہے۔ نوجوان لڑکے، لڑکیاں پیار و محبت کی باتیں کرتے وقت ہیر کی قربانی کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ وہی ہیر جو رانجھے کی بجائے موت سے ہمکنار ہو گئی۔ لیکن دنیا کے جھوٹے بندھنوں کو توڑ کر۔

میں نے کشتی کو دریا کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ اور وہ لہروں پر بہتی ہوئی اٹھکھیلیاں کرتی بہتی چلی جا رہی تھی، گلنار مجھ سے بہت قریب ہو چکی تھی۔

خوبصورت اور روشن چاندنی، قہقہے اور دریا کی ہلکی ہلکی آواز اور پرسکون فضا۔ وہ دونوں نازک اور خوبصورت کہنیوں کو اپنے زانوں پر ٹکائے اور خوبصورت ہاتھوں میں اپنی تھوڑی سنبھالے ہوئے تھی۔

"آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا"

گلنار نے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا

"کونسا"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

بھول گئے آپ"

"کچھ نہ پوچھئے۔ کبھی کبھی تو میں اپنا نام بھی بھول جاتا ہوں

"کہیں آپ ایسے میں مجھے بھی نہ بھول جایئے گا"

وہ کشتی کے ایک سرے کی جانب کھسکتے ہوئے بولی۔ اور ہاتھ سے پانی کے چھینٹے اچھالنے لگی۔

"میں تمہاری نگاہوں میں کھو کر ہی تو سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ تمہیں

کس طرح بھول سکتا ہوں

میں نے اس کی تھوڑی پکڑتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور ان میں ایک نشہ سا جھلکتا تھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں کے قریب اپنے ہونٹ لیجا کر کہا۔

یہ رات کتنی حسین ہے۔ یہ زندگی کتنی دلفریب ہے۔ اس قدر دلفریب کہ اگر اس میں ساری دنیا کے مصائب بھی برداشت کرنے پڑیں تو بھی دھندلی نہ پڑے۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے ترشے ہوئے ہونٹ میرے بالکل قریب تھے۔ گداز جسم میرے ساتھ۔ بے نواز آنکھیں مجھے سرور مہیا کر رہی تھیں۔ اور اس کے گھٹا جیسے بال میرے دل کو بے تاب کر رہے تھے۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ میرے بازوؤں میں ان جانی طاقت نہ جانے کہاں سے عود کر آئی تھی۔ اس کا مرمریں جسم میرے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہم یک جان دو قالب ہیں۔ میرے ہونٹ اس کے دہکتے ہوئے ہونٹوں کی گرمی محسوس کر رہے تھے۔ اور زندگی زندگی سے ہمکنار تھی۔

بادل کے ایک ٹکڑے نے چاند کو اپنی اوٹ میں لے لیا۔ فضا میں قدرے سیاہی پھیل گئی۔ دریا کے صاف شفاف پانی پر گرتی ہوئی روپہلی کرنیں سمٹ چکی تھیں۔ لیکن ہم ہر طرح ایک دوسرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر میں نے آنکھیں بند کر کے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ اور وہ میرے سر پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ اور پھر ایک دم چونک کر بولی۔

"خدارا اس نیند سے جاگئے۔ ہم بہت دور آ چکے ہیں"

"ہاں۔ ہم اتنی دور آ چکے ہیں۔ کہ یہاں سے لوٹنا مشکل ہے"

میں نے ویسے ہی بیٹھے جواب دیا۔

"تو کیا ہم واپس نہیں جا سکیں گے"

"نہیں"

"اف میرے خدایا اب کیا ہوگا!"

اس نے گھبراہٹ میں کہا۔ اور مجھ سے علیحدہ ہو کر بیٹھ گئی۔

اس لمبی شاہراہ پر گھبرا جانے والے کبھی منزل کو نہیں پا سکتے۔ میں نے اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔

"میں کہتی ہوں۔ ہماری کشتی بہت دور آ چکی ہے" وہ چیخنے کے سے انداز میں بولی۔

میں چونک پڑا۔ مجھے اس وقت خیال آیا۔ کہ واقعی ہم بہت دور نکل چکے ہیں، اور پھر رات کا سماں ہے، میں نے چپو سنبھال لئے۔ اور اسے تسلی دینے کے لئے کہا۔

"جان من۔ فکر کی چنداں ضرورت نہیں — ہم بہت جلد واپس پہنچ جائیں گے"

اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔ وہ اس وقت پانی میں تیرتی ہوئی کرنوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور پھر ان کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے سب کچھ بھول گیا میرے ہاتھ رک گئے۔ اور کشتی کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔

"[illegible] رہنے کا ارادہ ہے کیا؟"

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

"اس چاندنی رات اور اس خوبصورت سمے میں واپس چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ بس سوچتا ہوں کہ تمہیں سامنے بٹھا کر تکتا رہوں۔ اور یہاں تک کہ زندگی کی آخری گھڑی آ جائے۔ اور پھر موت کو بھی رکنے کے لئے کہہ دوں کہ تھوڑی دیر کے لئے رک جاؤ۔ ابھی جی نہیں بھرا۔ اور پھر موت کو یوں ہی تکتا رہوں"

"آخر یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے"

وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے کچھ بھی نہیں ہوا — ہاں ہاں مجھے کچھ ہو ضرور گیا ہے۔ ورنہ میں تمہیں سامنے بٹھا کر ایسی باتیں نہ کرتا"

میں نے اس کی جانب جھک کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

تیرے رنگین رس بھرے ہونٹوں کا لمس
اور پھر لمس طویل!
جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے یاد آتے ہیں
جو میں نے آج تک بسر ہی نہیں کی
اور اک ایسا مقام
"آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ"

میں یوں ہی گنگنانے لگا۔ اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کا سر میرے کندھے پر آ گیا۔ اور میں نے اس کے ہونٹوں کو انگلیوں سے سہلانا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ میں نے اس کو کندھے سے جدا کیا اور ہاتھ سے اس کی ہتھیلی کو تھام لیا۔ اس کے [illegible]

کی تیزی سینے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہو رہی تھی - پھر میں نے اپنے گال اس کے گالوں سے ملا دیئے - اور کافی دیر تک اس کے گالوں، ہونٹوں، اور گردن کو چومتا رہا -

وہ میری ہستی کے ایک ایک جزو پر چھا چکی تھی - وہ مجھ پر اس طرح چھا چکی تھی جس طرح مشرق سے اٹھتی ہوئی گھٹا - ایک دم سارے آسمان کو گھیرے میں لے لے -

اب وہ میری گرفت میں تھی - اس نے بھی اپنے بازوؤں کو میرے گرد حمائل کر دیا - اس کی گرفت تھی - ایک تسلط عجیب تھا - اس سپردگی عجیب تھی - اس نے خود میرے سپرد کر دیا - ایسی بے پناہ محبت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی - مجھے وہ تمام باتیں یاد تھیں - وہ تمام منظر میری آنکھوں میں تھے کس طرح ثمینہ نے اپنے حسن و شباب کے خزانے میرے لئے لٹا دیئے - کس طرح ڈیزی کا ادھورا رومان میری زندگی میں آیا - اور آ کر چلا گیا -

کشتی پھر سے پانی کے دھارے پر بہنے لگی تھی، اور ہم جذبات کے دھارے پر بہہ نکلے تھے — اور وہ دھارے ہمیں نہ جانے کس دنیا میں لے جا چکا تھا - دور کسی کے گانے کی آواز سنائی دی -

بہت قریب ہو، دل کو مگر قرار نہیں -
سکون سے جان حزیں اب بھی ہمکنار نہیں
یہ مانتا ہوں کہ تم سا وفا شعار نہیں

کشتی ڈول رہی تھی - دل دھڑک رہے تھے - سانسیں برابر تیزی اختیار کر رہی تھیں - اور آپس میں ٹکرا ٹکرا کر آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں پھر جذبات کے سمندر میں ایک ٹھہراؤ ایک سکون آ گیا - وہ زخمی پرندے

کی مانند پڑی تھی - اس کی آنکھیں بدستور بند تھی - اور خشک ہونٹوں پر آہستہ آہستہ زبان پھیر رہی تھی - میں نے چلو سے پانی اس کے ہونٹوں پر ٹپکایا - اس نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا - اور اس نے پھر نظریں پھیر لی - چہرے پر حیا کی سرخی پھیل چکی تھی - سانس عام رفتار پر آ چکی تھی - میں نے چپو اٹھانے پر زور زور سے چلانے شروع کر دیئے - لیکن میں بہت تھکن محسوس کر رہا تھا - میں جتنی تیزی سے کشتی کو واپس لانا چاہتا تھا، وہ میری ہمت سے بہت کم تھی - میں پھر ہمت سے کام لے کر چپو زور زور سے چلانے لگا لیکن تھوڑی دیر میں سانس پھولنے لگی تھی -

میں بڑی مشکل سے کشتی کو کنارے پر لا سکا - مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا - جیسے میرے بازو شل ہو چکے ہو - تمام بدن تھکا تھکا سا تھا - میں نے کنارے پر آ کر کشتی کو باندھا - گلنار کی طرف دیکھا - وہ اس طرح لیٹی ہوئی تھی - میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا - اس کی نظریں جھکی جھکی سی تھیں لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی — ایک ایسی مسکراہٹ جس طرح سب کچھ ہار کر مسکرانے کی کوشش کرتا ہے -

میں اسے سہارا دے کر باہر لایا - اور اسے کنارے پر بٹھا کر کشتی میں تھوڑا سا پانی ڈال دیا — دھبے — اور دھبے یہاں پر بھی تھے -

ثمینہ ہو یا گلنار — یہ دھبے ہر جگہ ہوتے ہیں، زندگی کے ساتھ میں اسے سہارا دے کر کافی دور تک لایا، رات کافی ہو چکی تھی - سواری کا کوئی خاص انتظام بھی نہ تھا - ہم چل رہے تھے - گلنار نے اپنا تمام بوجھ مجھ پر ڈال رکھا تھا - اور مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی - کہ اس کا مزید بوجھ اٹھا سکوں -

پھر راستے میں تانگہ مل گیا - اسے ہوسٹل میں چھوڑ کر جب گھر پہنچا

تو بالکل تھک چکا تھا۔ میں کپڑے اتارے بغیر ہی بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی نیند نہ جانے کہاں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی اور میں اس کے انتظار میں کروٹیں بدل رہا تھا۔

پھر ریلوے شیڈ کا الارم بجا۔ صبح قریب تھی۔ لیکن نیند مجھ سے دور میں نے زبردستی اپنے آپ کو نیند کے حوالے کرنے کی سعی کی۔ اور چادر کھینچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے گلنار کی محبت میں شبینہ کو بالکل بھلا دیا تھا۔ لیکن اسکے باوجود کبھی کبھی کوئی یاد میرے دل و دماغ پر چھا جاتی تھی۔ میں سوچتے سوچتے اچانک رک جاتا تھا۔ پھر شبینہ کا تصور دماغ کے کسی گوشے سے ابھرنے لگتا تھا ــ لیکن میری نظریں "ضیا" کی نگاہوں سے بچنے کے لئے اسے فوراً دماغ سے نکال پھینکنا چاہتی تھیں۔ اور میں کسی اور کی یاد میں گم ہو جاتا تھا۔

گلنار جو سچ مچ گلنار تھی۔ جس نے میرے دل و دماغ پر بسیرا کر لیا تھا، شام کے وقت میں گلنار سے ملنے گھر سے نکلا۔ سڑکوں پر زندگی بڑی پرسکون رفتار سے چل رہی تھی، دن بھر کے تھکے ہارے لوگ دل بہلانے کیلئے گھروں سے نکل پڑے تھے۔ ہر طرف بھیڑ بھاڑ اور جمگھٹا سا تھا۔ فٹ پاتھوں پر چلنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگ خراماں خراماں گپوں میں مشغول چل رہے تھے۔ آسمان پر پرندے [illegible] کی شکل میں اڑتے جا رہے

تھے ۔۔۔ فضا میں ہلکے مرمئی رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔

میں گلنار کے خیالوں میں ڈوبا ہوا جلد از جلد اس کے پاس پہنچنے کی تیزی میں تھا۔ کبھی کبھی فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر چلنے لگتا تھا۔ پھر اچانک گڑگڑ کی ایک آواز سنائی دی۔ اور میری نظروں میں ستارے سے چمکے۔ پھر تمام فضا میں اندھیرا سا چھا گیا۔

جب کو ہوش آیا۔ تو ہسپتال میں اپنے آپ کو پٹیوں میں جکڑا ہوا پایا۔ میں نے ہلنے کی کوشش کی تو مجھے فوراً کسی نے روک دیا۔ میں نے نظریں گھما کر دیکھا۔ تو ثمینہ میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں نے رحم طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھا میں نے کچھ بولنا چاہا۔ لیکن الفاظ میرے گلے میں چکر کاٹ کر رہ گئے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ جس کے جواب میں اس نے مجھے بتایا کہ میں اس کی موٹر کے نیچے آکر زخمی ہو گیا تھا۔ اور پھر بیہوشی کی حالت میں ہسپتال لایا گیا تھا۔ ثمینہ تمام راستہ میرے قریب بیٹھی رہی تھی۔ اور جب اس نے مجھے ہوش میں دیکھا۔ تو اس کے غم زدہ دل کو قدرے ڈھارس ہوئی تھی۔ خوشی سے اس کے آنسو بہہ نکلے تھے پھر جب قدرے آرام آیا۔ تو وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ضیا تو سارا سارا دن کام پر رہتا تھا۔ اور ثمینہ میری تیمارداری میں مصروف رہتی تھی میرے کہنے پر اس کو بلایا گیا۔ انہوں نے مجھے گھر لے جانا چاہا۔ لیکن ثمینہ نے یہ کہہ کر ٹال دیا "کہ جب تک انھیں آرام نہیں آئے گا۔ وہ مجھے جانے نہیں دے گی"۔ وہ گھر کے کاموں کو چھوڑ کر میرے سرہانے بیٹھی رہتی تھی۔ مجھے اخبار پڑھ کر سناتی مجھ سے باتیں کرتی اور بعض مرتبہ میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے پھیرتے میرے گالوں پر اپنے گال رکھ دیتی تھی۔ اور بعض مرتبہ کسی ایسی جگہ بھی ہاتھ پڑ جاتا تھا۔ میرے کراہنے پر وہ فوراً ہوشیار ہو جاتی تھی، اور ایسی نظروں سے دیکھتی جیسے مجھ سے اپنی غلطی کی معافی مانگ رہی ہو۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا۔ جیسے میرے جسم کا تمام دکھ درد مجھ سے کوسوں دور بھاگ چکا ہو۔ اور میں اپنی اداسی اور دکھ بھری آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگتا تھا۔ جہاں ایک شکایت بھری داستان تھی۔ وہ داستان جو میں اس سے بہت دنوں نہ ملا تھا۔ پھر میں شرمندگی سے نظریں چرا لیتا تھا۔ اور میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ کہ انسانی زندگی میں اتفاقات کو کس قدر دخل ہے ایک حادثہ جو اتفاقیہ میری زندگی میں آیا۔ میری ابتدائی محبت، اور دو بچھڑے ہوؤں کو ملانے کا باعث بنی۔ میں نے اپنے آپ کو اتفاقات کے حوالے کر دیا۔ اور اتفاقات نے مجھے ثمینہ کے حوالے کر دیا۔

میری پٹیاں کھل چکی تھیں۔ اور میں تھوڑا بہت چلنے پھرنے لگا تھا۔ میں نے اپنے گھر جانا چاہا۔ لیکن ثمینہ رضامند نہ ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک میں پوری طرح تندرست نہ ہو جاؤں وہ مجھے گھر نہیں جانے دینگے امی ہر روز آتیں تھیں۔ اور ثمینہ ان سے بھی یہی کہہ کر ٹال دیتی تھی۔ میں بستر پر پڑے پڑے تنگ آچکا تھا۔ اس لئے باہر نکل گیا۔ چونکہ زیادہ چل نہیں سکتا تھا۔ اس لئے ذرا دیر میں واپس پہنچا۔ تو ثمینہ میرے انتظار میں باہر کھڑی تھی وہ ذرا شکایتاً کہنے لگی،

"بہت دیر کر دی آپ نے"

"نہیں تو"

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

بہت دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔ میں ڈر رہی تھی۔ کہیں پھر کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔

اس کے ان لفظوں میں کس قدر محبت تھی۔ میں تھک چکا تھا۔ اس لئے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ وہ میرے ساتھ اندر آئی۔ اور پھر جا کر چائے لے آئی۔ اور مجھے کپ دیتے ہوئے بولی۔

"دیکھا کس قدر تھک چکے ہیں آپ۔ ابھی باہر نہیں جانا چاہیئے"

"میں نے بہانہ بنا لیا۔"

"آپ کے چہرے سے سب کچھ عیاں ہے"

وہ میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"آپ تو خوامخواہ میرے بارے میں پریشان ہیں۔ میں تو اچھا بھلا ہوں" میں نے ذرا ترش روئی سے کہا۔

وہ فوراً اٹھ کر اندر چلی گئی، میں نے محسوس کیا۔ کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ہیں۔ میں نے اسے بلانا چاہا۔ لیکن آواز نہ دے سکا۔ میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ کہ میں نے بہت برا کیا۔ جو ثمینہ کا دل توڑ دیا۔ وہ بچاری میرے لئے اپنے آرام کا خیال بھی نہیں کرتی۔ اور میں کس قدر خود غرض ہوں۔

"میں اس سے ضرور معافی مانگوں گا"

میں نے ارادہ کر لیا تھا، لیکن وہ باہر نہ آئی،

آدھی رات کا وقت تھا۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میں بڑی دیر سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ لیکن کسی کل چین نہیں پڑتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں شاید نیند کو مجھ پر ترس آجائے۔

ایک دم آنکھ کھل گئی۔ ایسا لگا جیسے کوئی پیشانی پر اپنا ٹھنڈا ٹھنڈا اور ملائم ہاتھ پھیر رہا ہو۔ جیسے کوئی میرے ماتھے پر سے بالوں کی لٹیں ہٹا رہا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ثمینہ میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ بہہ کر میرے سینے پر گر رہے تھے میں اٹھ کر بیٹھ گیا،

"ثمینہ مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارا دل دکھایا ہے"

میں نے اس کے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں کہ میں ضیا کی بیوی ہوتے ہوئے بھی سب کچھ آپ کی ہوں۔ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ معافی مجھے مانگنی چاہیے۔ نہ کہ آپ کو"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے آہستہ سے اس کے نچلے ہونٹ کو پکڑ لیا۔ اور اسے ہولے ہولے مسلنے لگا۔ اس کے چہرے پر شرم کی ایک لکیر دوڑ گئی۔ میں نے اس کی حنائی انگلیوں کو تھام لیا۔ پھر اس نے میرے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا میں نے اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔ اب وہ میرے قریب بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ بالکل میرے بالکل قریب۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے اس کے لبوں پر شکایت نہیں تھی۔ اس کی بجائے آنکھوں میں تشکین اور سکون کا ملا جلا امتیاز تھا۔ اور ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم رقصاں تھا۔

رات کی تاریکی اور زیادہ تاریک ہو چکی تھی۔ اب کمرے میں بھی مکمل اندھیرا تھا۔ کیونکہ میں نے کمرے کی سبز روشنی بھی بند کر دی تھی، پھر مجھے اس تاریکی سے الجھن سی ہونے لگی۔ اور کمرے کی تمام کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے کچھ گھٹن کی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر باغیچے کی طرف والی کھڑکی کھول دی۔ چاند کی کرنوں نے کمرے کی فضا میں اپنا جال سا پھیلا دیا۔ ثمینہ کھڑکی کی جانب منہ کئے لیٹی ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا میں نے جھک کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی میں نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خدارا اب تو سونے دیجئے۔ آپ کو نیند نہیں آتی کیا"

اس نے بناوٹی غصے سے مجھے کہا۔

"مجھے ان چاندنی راتوں میں نیند نہیں آتی۔ اور پھر جب تم بھی میرے پاس ہو۔ تو نیند کا یہاں کیسے گزر ہو سکتا ہے" میں نے اس کے گال پر اپنی تھوڑی رگڑتے ہوئے کہا۔

اب تو تنگ نہ کیجئے مجھے"

وہ اپنی گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"تنگ تو مجھے تم کرتی ہو"

"تو میں آپ کے پاس نہ آیا کروں کیا؟"

اس نے اٹھتے ہوئے کہا

"اوہو۔ تم تو ناراض ہو گئیں۔

میں نے اسے روکتے ہوئے کہا

"اب مجھے جانا چاہیئے۔ کہیں ضیا صاحب نہ دیکھ لیں"

"وہ تو نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ یہ شوخ چاند ضرور دیکھ رہا ہے۔ چاند کی طرف دور سے دیکھو۔ یہ اونچے آسمان میں تیرتا ہوا کیسا خوبصورت معلوم ہو رہا ہے۔ چاندنی کیسی طرح کھلی ہوئی ہے۔ بالکل تمہارے حسن کی مانند اور اب بھی وہ چوری چوری تمہارا حسن حاصل کر رہا ہے۔ یہ کرنیں شہد کی مکھیوں کی مانند تمہارا حسن چرا رہی ہیں۔ تمہارے ان لبوں کا رنگ باغیچے میں کھلے ہوئے گلاب کے پھول سے زیادہ سرخ ہے۔ تمہاری آنکھوں میں نئی کھلی ہوئی کلی سے زیادہ تازگی ہے۔ تمہارے گال پر چاند کی کرنوں کا گمان ہوتا ہے۔ تمہارے ترشے ہوئے ہونٹ۔ اور وہ خمیدہ ابرو اور ان دونوں سے زیادہ تمہاری سادگی۔ بے ساختہ باتیں اور تمہاری مسکراہٹ۔ مجھے بہت پسند ہیں۔ میرا دل تمہارے بڑے بڑے طوفانوں سے ٹکر لینے کو چاہتا ہے خواہ اس میں بہہ ہی کیوں نہ جائے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ تم میرے ہمیشہ قریب رہو۔ کوئی طاقت ہمارے بیچ حائل نہ ہو۔ میں تمہارے بالوں کو بناتا اور بگاڑتا رہوں، میں تمہارے حسن کو دیکھ کر خوش رہوں۔ میں تمہارے قرب میں زندگی کے دن گذار دوں۔

وہ میری پاگلوں کی سی باتیں سنتی رہی۔ اور ٹکٹکی باندھے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ کہ میں وقتی طور پر بہت زیادہ جذباتی ہو جاتا ہوں۔ میں ہر اس لڑکی سے جس سے میرے تھوڑے بہت تعلقات ہو جائیں۔ اپنی محبت جتلاتا ہوں۔ اور وہ بھی اس قدر کہ وہ پاگل خیال کرنے لگتی ہے۔ یہی حال ثمینہ کا تھا۔ وہ میری باتوں سے بالکل بے خبر تھی، نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔

پھر وہ میرے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ اور میں اس سے باتیں کہتا ہی

رہا۔ اور وہ چپ چاپ ضیا کے کمرے کے اندر جھانک کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اب میں ثمینہ کے بجائے خلا میں گھورنے لگا تھا۔ چاندنی بھیگ چکی تھی۔ فضا میں مکمل خاموشی تھی۔ کبھی کبھی کسی کتے کی بھونکنے کی آواز سنائی دیتی تھی یا سڑک پر سے کوئی تانگہ گذرتا تو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دینے لگتی تھی، پھر آواز دور ہوتی جاتی تھی۔ اور خاموشی میں حل ہو جاتی تھی۔

"ثمینہ چلی گئی" —

میں نے اپنے دل سے کہا۔

میں نے سونا چاہا۔ لیکن نیند نہ آئی — اس رات میرا دل بہت گھبرایا، زندگی کی ساری بیتی ہوئی باتیں، یادیں۔ ایک ایک کر کے ذہن میں ابھرنے لگیں — ثمینہ — ڈینی۔ اور پھر گلنار رات کی تاریکی میں ابھر رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے۔ بار بار۔ بالکل اس مداری کے تماشے کی مانند جو بچوں کو ایک پیسے کے بدلے میں بہت سی تصویریں دکھلاتا ہے، بارہ من کی دھوبن دیکھو۔ بمبئی کا بازار دیکھو، تاج محل آگرہ دیکھو۔

نہیں اب مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیئے، میں کل گھر ضرور چلا جاؤں گا۔ مجھے ثمینہ سے کیا حاصل میں گلنار سے بھی مل سکتا ہوں، مجھے یہاں پڑے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور پھر ضیا نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہو گا۔ صبح میں ضرور یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

میں نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ کمرے میں مکمل تاریکی ہو گئی، میں وہاں بستر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے ثمینہ لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن اب وہاں چادر کی شکنوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

بارش کا زور ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ اور پھر ہوا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے انہوں نے آپس میں شرط باندھ رکھی ہو۔ اور دونوں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش میں ہوں۔ شائیں شائیں کی دراوئی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے بہت سے بھوت مل کر ہوا میں پرواز کر رہے ہوں۔ اور پھر بارش کی آواز اس شائیں شائیں کو اور پر دہشت بنا رہی تھی۔ دریا کا شور۔ موجوں کے تھپیڑے۔ لہروں کی گونج ان میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔

جھونپڑے کی چھت پوری کی پوری ٹپک رہی تھی۔ اور فرش بالکل کیچڑ بن چکا تھا۔ دیواروں سے مٹی بہہ بہہ کر فرش پر پھیل چکی تھی۔ اور پھر دروازے کی دراڑوں سے نکل کر آنے والی ہوا نے اندر کی فضا کو سرد بنا دیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ شکستہ جھونپڑی باہر کی موسلا دھار بارش سے انھیں

بچائے ہوئے تھی۔ اور دیواروں نے ہوا کو روک ہی رکھا تھا۔

پہلے سائے نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اور دیوار سے لگ کر اس کے سہارے بیٹھ گیا۔

اس کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں، اس نے بھیگے ہوئے کوٹ کو ہاتھ سے جھاڑا۔ اور اس کے کالروں کو گردن سے بالکل لپیٹ لیا۔ پھر ہیٹ کو سر سے اونچا کر کے انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ پھر ذرا رک کر بولا۔

"یہ رات میری زندگی کی سب سے بھاری ہے۔ ایسی کتنی راتیں میں نے عیش و عشرت میں ڈوب کر گزاری تھیں۔ مجھے اس رات کی کہاں امید تھی — اور یار تم بھی کچھ کہو میرا تو گلا دکھنے لگا۔ اور ہاں میں نے اپنی داستان بھی تو ادھوری رہنے دی — تم بھی خیال کرتے ہو گے۔ کہ کیسے بے وقوف اور پاگل سے واسطہ پڑا ہے — ہاں بھئی ہاں۔ میں پاگل ہی ہوں تبھی تو سب کچھ کہے جا رہا ہوں۔ یار اس سالی سگرٹ کی بات نے مار ڈالا۔ آج اس کی طلب اس قدر ہو رہی ہے۔ کہ بس کیا کہوں۔ لیکن یہ سگرٹ بھی تو بھیگ چکا ہے۔ اور پھر ماچس بھی تو نہیں۔ ورنہ اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لیے گرم کیا جا سکتا تھا۔

"سگرٹ پیتے ہو کیا" — نہیں نہیں پینی بھی نہیں چاہیے، یہ بہت بری چیز ہے — زہریلی چیز، سنا ہے اس میں ایک زہر ہوتا ہے جس کی ایک بوند کئی انسانوں کی جان لے سکتی ہے، لیکن آج ہم خودکشی کرنے نکلے تو دریا میں چھلانگ لگانے کی سوجھی۔ جب سگرٹ میں زہر ہے۔ وہی زہر استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

میں کیسی باتیں کرنے لگا تھا۔ پاگل جو ٹھہرا۔ اور پھر آج سردی

بھی مار ڈالے گی، بارش تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کپڑے سارے کے سارے بھیگ چکے ہیں — یہ سگرٹ بھی بالکل چکا ہے۔ لیکن میں جو داستان کہہ رہا ہوں۔ وہی سہی۔ اس سے دل تو بہلا رہے گا۔

وہ رات ثمینہ کے جانے کے بعد بڑی مشکل سے کٹی۔ صبح اٹھ کر سب سے پہلے ضیا سے مڈبھیڑ ہوئی۔

"پرویز صاحب کیسی طبیعت ہے آپ کی"

انھوں نے اپنا چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے کہا

"ٹھیک ہوں"

میں نے روکھے پن سے جواب دیا

"بھئی میں آجکل کام میں اس قدر مصروف ہوں۔ کہ آپ سے دو گھڑی باتیں بھی نہیں کر سکتا۔ پھر اس خیال سے کہ ثمینہ جو گھر پر ہے۔ اور پھر دونوں بچپن کے ساتھی اور دوست بھی۔ بھلا میں کون ہوں تم دونوں کے بیچ میں آنے والا۔ میں لائنس کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ بس ادھر لائسنس ملا اور ادھر پیسے کھرے کیے ....."

"لائنس بھی کیا خوب شے ہے"

وہ کہے جا رہا تھا۔ اور میں اس کی باتوں سے بالکل بور ہو چکا تھا کیونکہ مجھے کسی لائسنس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اگر واسطہ تھا تو صرف ثمینہ سے لیکن رات کی بات نے مجھے بالکل بدل کے رکھ دیا تھا۔

"ضیا صاحب آج میں واپس جا رہا ہوں۔ کیونکہ میں مکمل طور پر صحت پا چکا ہوں۔ اور میری ماں بھی انتظار کر کے تھک چکی ہو گی، آپ لوگوں نے بہت نوازش جو اتنے دن میرے علاج معالجے پر صرف کیے

ورنہ کون کسی کے لئے تکلیفیں برداشت کرتا ہے "

میں نے منہ دوسری طرف پھیر کر سب کچھ کہہ دیا۔

بھئی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ گھر بھی تو آپ کا اپنا گھر ہے۔ اور پھر آپ کی صحت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔ آپ کو یہاں رکنا ہی ہوگا۔ اور پھر گھر میں ثمینہ کا بھی تو دل لگا رہتا ہے۔ اور میں مصروف بھی ہوں " اس نے عینک کو ناک پر جماتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ مجھے ثمینہ کے لئے کھلونا سمجھتے ہیں۔۔۔۔ میں آج گھر جا رہا ہوں بلکہ ابھی۔ میں اب یہاں ٹھہرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں"

میں نے ترش روئی سے کہا۔

" آپ تو ناراض ہوں گے۔ غصہ تھوک دیجئے اور آئیے میرے ساتھ"

وہ مجھے کھینچتے ہوئے اپنے خاص کمرے میں لے گئے۔ یہ میرا پہلا موقعہ تھا کہ اس کے کمرے میں قدم رکھوں اس نے اپنے کمرے میں بہت سی عجیب و غریب تصویریں آویزاں رکھی تھیں۔ جو انسان کے جذبات کو ابھارنے کا کام دیتی تھیں۔ میں ایک ایک کر کے تصویروں کو دیکھ رہا تھا،

" تشریف رکھئے "

ضیا نے ایک الماری کھولتے ہوئے کہا

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا، اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

" آج مجھے آپ کا غصہ دور کرنا ہی ہوگا۔ شاید آپ کو یہ شکایت ہے کہ میں آپ کے پاس کیوں نہیں بیٹھتا۔ ضیا نے میرے قریب میز پر دو پیگ اور شراب کی صراحی رکھتے ہوئے کہا۔

" نہیں میں نہیں پیوں گا "

میں نے یونہی بہانہ بنایا۔

اس نے دو پیگ بنائے اور میری طرف بڑھاتے ہوئے۔

" انسان کے دل کو صاف کرنے کی صحیح دوا ——— اسے پی ہی لو اور غصہ نکال دو "

میں نے اس خوبصورت پیگ کی جانب دیکھا جس کے اندر سے شراب جھانک جھانک کر کہہ رہی تھی " ہاتھ بڑھاؤ۔ اور مجھے چوم لو "

میں نے چپ چاپ پیگ اٹھایا۔ اور ایک ہی سانس میں اسے خالی کر دیا۔ ضیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی " بہت اچھے۔ میری گڈ " اس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے۔ اور پھر پیگ کے پیگ بھنے لگے۔ اور میں پیتا چلا گیا۔ پھر مجھے وہ تمام کمرہ گھومتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ اور میں وہیں کرسی پر لیٹ گیا۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو ضیا وہاں نہیں تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے سہارا دے کر اٹھا رہا ہے میں نے نیم وا آنکھیں سے دیکھا۔ تو ثمینہ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا رہی تھی میں اٹھا۔ اور اپنا تمام بوجھ اس کے کندھے پر ڈال دیا۔ اور ایک ہاتھ سے اس کے گال سہلانے لگا۔ اور دوسرا گال میرے گال سے مس ہو رہا تھا۔

اس نے وہاں سے اٹھا کر مجھے پلنگ پر لٹا دیا۔ اور خود وہاں سے جانے لگی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ وہ مجھ پر آ رہی مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں نے اور بہت سے پیگ چڑھا لئے ہوں اور ان کا نشہ میرے تمام اعضاء کو اپنے قبضے میں لے چکا ہو۔ میں پھر اور پیگ پینے لگا۔ اور وہ پیگ پینے سے کچھ اس طرح محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے میں

آسمان کی وسعتوں میں اڑتا جا رہا ہوں، دور افق کی جانب۔

پھر ثمینہ چلی گئی اور میں وہیں بیٹھا رہا۔ جب ذرا نشہ کم ہوا۔ تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت بشاش پایا۔ پھر شام ہو گئی۔ میں سیر کے بہانے وہاں سے نکلا۔ اور سیدھا گھر پہنچا۔

ماں بہت پریشان تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی دوڑی ہوئی آئی۔ اور پھر غصے کے انداز میں بولی۔

"تمہیں گھر کا راستہ مل ہی گیا"

"ہاں"

میں بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہہ سکا۔

"ذرا دیکھ کر چلا کرو۔ اور آجکل تم جانتے ہو۔ زمانہ بہت نازک ہے"

"ہاں۔ ہاں زمانہ بہت نازک ہے"

میں نے اپنے کمرے کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

رات تک میں گھر پر رہا۔ لیکن میرا دل وہاں نہ لگا۔ یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کسی اجنبی جگہ پر آگیا ہوں۔ دل بہت بے چین تھا، اور کہہ رہا تھا یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کسی اجنبی جگہ پر آگیا ہوں۔ دل بہت بے چین تھا اور کہہ رہا تھا۔ کہ ثمینہ ـ پاس چلو۔ یہاں اب کیا رہ گیا ہے۔ سب کچھ وہیں ہے۔ ماں سے بہانہ کر کے چلے چلو۔ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہو گی،

میں چپکے سے وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ نہ جانے کونسی طاقت تھی جو مجھے ادھر کھینچے لے گئی۔ میں دیوانوں کی طرح وہاں پہنچا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں کیوں جا رہا ہوں۔ کس کے لئے۔ کس واسطے۔ مگر کوئی مجھے کھینچے لئے جا رہا ہے۔

جب میں وہاں پہنچا۔ تو معلوم ہوا، کہ ثمینہ اور ضیا سیر کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں باغیچے میں جا کر ٹہلنے لگا، لیکن دل بہت بیتاب معلوم ہو رہا تھا۔ پھر ثمینہ دور سے آتی نظر آئی۔ وہ اکیلی تھی۔ بالکل اکیلی چاندنی رات میں اس کے تناسب جسم کا سایہ بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بالکل میرے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ چاندنی درختوں سے چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ اس کے جسم کی خوشبو نے، اس کے جسم کے لمس اور حسن کی محصور تھا۔

"چلو اندر چلیں" وہ آہستہ سے بولی۔

"ضیا.... اور اس جہاں میں اس نے پوچھا

وہ اپنے ایک دوست کے ہاں چلے گئے ہیں۔ شاید صبح کو لوٹیں

میرا دل اور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور سامنے بے اختیاری اختیار کر چکی تھی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اور اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔

"کیا میں ضیا صاحب کے کمرے میں جا سکتا ہوں۔

"کس لئے" اس نے سوال کیا

یونہی۔ ذرا......

وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔

وہ سب کچھ یہاں پہنچ جائے گا۔ وہ اٹھی۔ اور اپنے کمرے میں لباس تبدیل کرنے کے لئے چلی گئی۔ میں وہاں سگرٹ سے دل بہلاتا رہا۔ جب وہ واپس لوٹی۔ تو اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ بال کھلے تھے میری نظریں ایک بار اس کے تمام جسم سے گھوم کر اس کے ہاتھوں میں تھمی ہوئی

صراحی پر رک گئیں تھیں۔

اب میرے سامنے دو صراحیاں تھیں۔ اور دونوں شراب سے بھری ہوئی تھیں۔ ایک سے دوسری میں اور دوسری سے پہلی میں زیادہ نشہ تھا پھر میں باری باری دونوں سے شراب پینے لگا۔

جی چاہتا تھا کہ یونہی پیتا جاؤں۔ عمر بھر.....

پھر میری نظروں میں ثمینہ کی اس وقت کی تصویر پھر گئی۔ جب وہ ضیا کے ساتھ انارکلی میں ملی تھی۔ اور آج کی ثمینہ میں اس وقت کی ثمینہ میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اب اس پر بھرپور جوانی تھی۔ اور جوانی کا نشہ بھی۔ اور میں دو نشوں میں مست تھا۔

اب میرے لئے وہاں سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ سارا دن شراب اور ثمینہ سے دل بہلانے میں کٹ جاتا۔ اور رات میں بھی ان سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ ضیا بہت رات گئے گھر لوٹتا اور چند ایک رسمی باتوں کے اس سے زیادہ کچھ کہنے سننے کا موقعہ ہی نہیں ملتا تھا۔

پھر جب کہ شام ڈھل رہی تھی۔ میں اور ثمینہ باغیچے میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے دور افق پر گھنٹی شفق کا منظر بڑا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ اور پھر وہ شام کتنی خوبصورت تھی۔ یہ زندگی کتنی دلفریب ہے۔ پھر رات گہری ہونے لگی۔ پھر چاندنی کھل پڑی۔ میں نے چاند کی جانب دیکھتے ہوئے کہا

"کتنا اچھا چاند ہے آج کی رات"

"ہاں چودھویں کا چاند ہمیشہ خوبصورت ہوتا ہے"

ثمینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چاندنی راتیں کتنی دلفریب ہوتی ہیں!"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ایسی رات میں دریا کی سیر میں بڑا لطف آتا ہے۔ یہ رات پھر نہ آئے گی۔ جوانی بیت جائے گی۔"

وہ گنگنانے لگی۔

میں کچھ سوچنے لگی۔ ایسی ہی ایک چاندنی رات تھی۔ جب میں گلنار کے ساتھ تھا۔ دریا میں کشتی لہروں کے دوش پر بہتی چلی جارہی تھی۔ اور پھر ..... وہ رات کتنی حسین تھی۔ کتنی دلکش لیکن اب میں بہت دنوں سے اسے ملا بھی نہیں۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ مجھے اس سے بالکل محبت نہیں لیکن پھر بھی ہے۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے ..... اور پھر وہ خوبصورت بھی ہے۔ اور مجھ پر جان بھی دیتی ہے۔ ایسے میں مجھے اس سے دور نہیں ہونا چاہیئے" میں سوچنے لگا۔

"کس سوچ میں ڈوبے ہیں آپ"

شمینہ نے مجھے ہلاتے ہوئے کہا

کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔

میں چونک پڑا .....

"آج کی رات بڑی سہانی ہے۔ کیا کوئی پروگرام نہیں بنے گا"

شمینہ نے پروگرام پر زور دیتے ہوئے کہا۔

کیا مطلب"

"یعنی آج ضیا صاحب گھر نہیں آرہے ہیں۔ وہ دو چار دن کیلئے باہر چلے گئے ہیں، میرا خیال ہے کہیں باہر چلا جائے۔

"باہر کی بجائے اندر چلتے ہیں"

پھر وہ رات پر میری آغوش میں پڑی میری اس رات کو مہکاتی رہی میں نے اسے جی بھر کر پیار کیا۔ اس کے بال میرے شانوں پر پریشان تھے میں کبھی اس کے ہونٹوں کو چومتا، کبھی ابروؤں کی تعریف کرتا۔ کبھی اس کی مسکراہٹ میں کھو جاتا۔ اس عالم میں میں نے اس کے جسم کی تعریف کی۔ اور اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ضیا صاحب بھی یہی کہتے ہیں۔

مجھے جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ ضیا صاحب نے بھی یہی کہا ہو وہ کیا جانے گرمی اور حرارت کو۔ برف حرارت سے پگھل کر رہ جائے گی۔ پھر وہ مجھے لال اور سفید دھبے میری آنکھوں میں ناچتے لگے۔

"تم بکتی ہو۔ تم جھوٹ کہتی ہو"

میں اس سے علیحدہ ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ میری اس بات سے گھبرا سی گئی۔ اور ذرا رک رک کر بولی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اور اگر نہیں ہوا۔ تو ہو جاؤں گا، میں نہیں چاہتا۔ کہ تم ایسے وقت میں ضیا کا نام لیا کرو۔ ضیا کے نام سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اب یہاں نہیں آؤں گا۔ یہ میری آخری رات ہو گی۔ اب میں یہاں کبھی قدم نہیں رکھوں گا"

وہ رونے لگی۔ اور میرے کندھوں پر سر رکھ کر اس نے بتایا، کہ وہ ان راتوں کی یادگار کو ایک بچے کی صورت میں مجسم کرنے والی ہے

"میرا بچہ"

"یہ کیوں کر ہو سکتا ہے"

"سب کچھ ہوتا رہا ہے۔

"میں آپ کو یہاں سے جانے نہیں دوں گی۔ میں نے محبت کی تھی۔ اور آج اس کی محبت کا ثمرہ مجھے نظر آ رہا ہے"

وہ آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے بولی۔

"لیکن"

"آپ رک کیوں گئے"

"کچھ نہیں ثمینہ کچھ نہیں"

"آپ کو میری قسم آپ زبان پر آئی ہوئی بات کو نہ روکیے۔"

"ثمینہ یہ بچہ ضیا کے نام لکھا جائے گا۔ میں کس طرح اسے اپنا بچہ کہہ سکوں گا"۔ میں ثمینہ یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہو گا"

میں نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

"نہیں پرویز یہ میرا اور آپ کا بچہ ہو گا۔ صرف ہم دونوں کا"

وہ ذرا جوش لیجے میں بولی۔

لیکن یہ دنیا۔ یہ لوگ کبھی یہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ وہ مجھے بدکردار اور تمہیں بدچلن کہیں گے۔ تم پر انگلیاں اٹھیں گی، اور مجھ سے کوئی بات کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ یہ نہیں ہو سکے گا ثمینہ لوگوں کی نگاہوں میں یہ بچہ ضیا کا ہی ہو گا۔ اور اسی کے نام سے پکارا جائے گا

"میں تمہاری خاطر یہ سب کچھ برداشت کر لوں گی"

یہ نہیں ہو سکے گا، یہ نہیں ہو سکے گا۔ ثمینہ اسے باہر نکال پھینکو

آج تک میں یہ کبھی سوچ بھی نہیں پایا تھا۔ کہ یہ معاملہ اتنا لمبا ہو جائے گا"

"آخر آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ میں آپ کی ہوں صرف آپ کی"

میں نے اس کے رخسار اور ہونٹوں کو چوم لیا۔ اور کہا" خدا کرے کہ تم سچ مچ میری بن جاؤ"

میں تو آپ کی ہی ہوں۔ ہمیشہ کے لئے" آپ کی"

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اور میرا دل بھی بھر آیا، میں اسے علیحدہ کرتے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے صراحی کو سامنے رکھ لیا۔ اور لگاتار پینے لگا۔ اور پیتا چلا گیا۔ اور پھر میں اسی طرح کافی رات گئے تک بےہوش رہا جب ہوش آیا تو دوسرے کمرے سے ضیا اور ثمینہ کی دبی دبی کھسر پھسر سنائی دے رہی تھی،

"اب اسے یہاں سے چلا جانا چاہیئے"

ضیا کی آواز سنائی دی۔

"لیکن کیوں"

یہ ثمینہ کی آواز تھی۔

"ثمینہ تم نہیں جانتی۔ زمانے والے کسی کو معاف نہیں کرتے۔ اور کوئی دوست مجھے اس کے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔ لیکن میں تمہارا چچازاد بھائی کہہ کر ٹال دیتا ہوں، لیکن یہ ناٹک کب تک چلتا رہے گا" وہ ذرا تیزی سے بولا۔

"یہ ناٹک تم ہی نے تو شروع کیا تھا۔

"ہاں اب میں چاہتا ہوں۔ کہ اس کا خاتمہ ہو جائے۔

"آخر کیوں۔ اب اتنی جلدی کیوں خیال آ گیا۔

"آخر تم ان باتوں کو سمجھتی کیوں نہیں"

"اب یہ باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ....."

"رک کیوں گئے۔ کہ تم اس قابل ہی ....." ثمینہ قدرے تیز ہو کر بولی

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ چکا تھا۔ کہ سب کچھ میرے بارے میں کہا جا رہا ہے۔ اب قدرے خاموشی چھا چکی تھی۔ مجھ پر نشے کا اثر باقی تھا پھر بھی میں اٹھ کر دروازے کے قریب جا کر بیٹھ گیا،

"جواب کیوں نہیں دیتے۔ اب چپ کیوں ہو" ثمینہ بول رہی تھی۔

"تم آخر چاہتی کیا ہو" ضیا بڑے عاجزانہ آواز سے بولا۔

"وہ یہاں رہے گا، اور اسے کوئی یہاں سے نکال نہیں سکے گا،

"لیکن میری عزت"

"اگر آپ کو اپنی عزت کا اتنا ہی خیال تھا، تو شادی نہ کی ہوتی"

"میں نے گناہ نہیں کیا"

اس سے بڑھ کر گناہ ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تم اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں سمجھتے تھے۔ تو پھر میری زندگی تباہ کیوں کی۔ اور پھر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے مجھے اس بات پر آمادہ کیا۔ لیکن اب میں اسے کسی حالت میں بھی چھوڑ نہیں سکتی

"میں نے یہ سب کچھ اس روپے پیسے اور جائداد کے لئے کیا۔ مجھے ایک وارث کی ضرورت تھی، جسے میں اپنا بیٹا کہہ سکوں، اور اسے اپنی تمام جائداد کا مالک بنا سکوں، محض میں نے یہ سب کچھ امی کے لئے کیا"

تم نے محض اپنے مقصد کے لئے دو زندگیوں کو تباہ کر دیا ہے۔ تم ہم

دونوں کی محبت کے راستے میں چٹان بن کر حائل ہو گئے، اور اب اس محبت کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ اور اب کہ تمہارا مقصد نکل آیا۔ تو اب اسے اس چٹان کے نیچے پیس ڈالنا چاہتے ہو، یہ کبھی نہیں ہوگا۔"

ثمینہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی،

"میں جو کچھ کہتا ہوں۔ تمہیں میرا حکم ماننا ہوگا"

ضیا غصے بھرے ہوئے لہجے میں چیخا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں کسی کا حکم ماننے کو تیار نہیں ہوں۔

ایک تھپڑ کی آواز سنائی دی۔ اور پھر دروازہ کھلنے اور زور سے بند ہونے کی آواز آئی پھر ثمینہ کی سسکیاں لینے کی آواز آنے لگی۔

میں اٹھ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ اور میں اندھیرے میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اپنے دماغ پر ایک بوجھ محسوس ہونے لگا، میں نے آہستہ سے قریب پڑے ہوئے میز کی جانب ہاتھ بڑھایا اور ٹٹول کر صراحی کو اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ خالی ہونے کے بعد میں نے اسے فرش پر پھینک دیا۔ میرے دماغ سے تمام باتیں اور تمام بوجھ اتر گیا۔ اور آنکھیں بند ہونا شروع ہو گئیں۔

میں سویرے ہی چپ چاپ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ بہت دنوں کے بعد جب گھر پہنچا، تو معلوم ہوا کہ ماں سخت بیمار ہے۔ اور زندگی کی آخری منزل کے قریب پہنچ چکی ہے۔ میں جلدی سے اندر گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ لیکن وہ رونق تھوڑی دیر کی تھی میں نے علاج کے لئے کافی بھاگ دوڑ کی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور آخر وہ منحوس دن آپہنچا۔ جب وہ مجھے اس بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہوگئی۔

اب مجھے اس دنیا میں کسی سے محبت نہیں تھی۔ گھر میں کافی کچھ تھا میں نے دل کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے شراب پینا شروع کر دی۔ سارا سارا دن پیتے گزر جاتا تھا۔ اور پھر رات کو بھی اس وقت سے چھٹکارا نہیں تھا۔ شراب کے ساتھ ساتھ ایک اور خواہش تھی، جو اکثر بیدار ہو جاتی تھی۔ وہ تھی ثمینہ

میں نے اسے بھولنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ حالات نے جیسے میری زندگی سے ساری خوشیاں چھین لی ہوں۔

میں اس کے بارے میں سوچتے ہوئے تنہائیوں میں بھٹک رہا تھا میری زندگی کی شاہراہ اداس تھی۔ ایک بے پناہ افسردگی، ایک زبردست خلا مجھے گھیرے ہوئے تھا۔ میں بہت اداس ہو چکا تھا۔ مجھے گھر کے کونے کونے سے وحشت برستی معلوم ہوتی تھی۔

میں کئی راتوں سے سو نہیں سکا تھا۔ شراب میرے لئے کچھ بھی نہ کر سکی میرے لئے ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل تھا میرے گھر میں کوئی بھی نہیں صرف میں ہوں۔ اگر میں بیمار ہو جاؤں تو مجھے کون پوچھے گا۔ اور اگر میں مر جاؤں گا تو کسی کو کیا خبر۔

پھر ایک دن ضیا صاحب خود ہی آپہنچے۔ میں اس وقت شراب پی رہا تھا، وہ میرے قریب آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"لو پیو"

میں نے پیگ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں"۔

"کیوں نہیں۔ تمہیں پینا ہوگا"

اس نے پیگ اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ اور پھر اسے خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

پرویز۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا، میں تمہیں لینے آیا ہوں، چلو جلدی سے ثمینہ کی طبیعت خراب ہے۔

"طبیعت خراب ہے کیا ہوا۔"

میں نے پوچھا۔

"جب سے تم آئے ہو۔ پہلے چند دن وہ چپ چپ رہی۔ اب جبکہ اس کی صحت گر چکی ہے میں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ ان کے خیال میں اسے کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ اور مجھے معلوم تھا کہ یہ صدمہ محض تمہاری وجہ سے پہنچا ہے۔ کیونکہ تم اسے کچھ کہے بغیر واپس آ گئے۔ اب میں تمہیں لینے آیا ہوں جلدی کرو"

"میں ضرور چلوں گا ضیا صاحب"

میں جلدی سے اٹھا اور گھر کو بند کر کے اس کے ساتھ چل پڑا۔ جب میں ان کے ہاں پہنچا۔ تو وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی مجھے دیکھ کر اس کے پژمردہ چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں چپ چاپ اس کے قریب جا کھڑا ہوا مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ثمینہ کے چہرے کا رنگ کھل رہا ہو۔ جب تک وہ بیمار رہی اس سے باتیں کرتا۔ اس کا دل بہلاتا۔ میں راتوں کو بھی نہ سو سکتا تھا۔

وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی۔ گئی ہوئی تندرستی واپس آ چکی تھی۔ لیکن اس کی زبان پر میری بے وفائی کے جملے چڑھے ہوئے تھے۔

"اگر میں مر جاتی تو"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا"

"اگر چند دن اور نہ آتے۔ تو میری لاش ہی دیکھتے"

"میں تمہیں موت کے ظالم ہاتھوں سے واپس لے آتا۔ میں ان [illegible]

میں نے اسے آغوش میں بھینچ لیا۔ اور اس سے چومتے ہوئے کہا۔
کتنا آرام ہے۔ کتنا سکون میسر ہوا ہے مجھے۔ مجھے بس کچھ اور نہیں چاہیئے۔ اگر میں یہاں نہ آتا۔ تو پاگل ہو جاتا۔

"میرے پرویز میں تمہیں پاگل نہیں ہونے دوں گی"

کتنی بھولی تھی ثمینہ۔ پاگل کہیں کی۔

اب پھر وہی دن لوٹ آئے تھے۔ وہی راتیں واپس آ گئی تھیں۔ شراب اور ثمینہ دونوں میرے قریب تھیں۔ اور میں ان میں دل بہلاتا اور وقت گزرتا رہا تھا۔ رات دن اور دن رات میں تبدیل ہو رہے تھے۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے۔ ثمینہ کے تناسب جسم میں پھیلاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ چہرے کا رنگ پیلا ہو چکا تھا۔ آنکھیں گڑھے کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ اس کے لئے زیادہ چلنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ اور مجھے اکیلے میں اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اکیلی شراب سے کب تک دل بہلا سکتا تھا۔

پھر ایک دن گلنار کا خیال ذہن میں آ گیا۔ ثمینہ نہ سہی گلنار ہی سہی وہ بھی تو مجھے محبت جتلا رہی ہے۔ اس سے ہی دل بہلانا چاہیئے۔ میں اٹھا اور ثمینہ کے کمرے میں گیا وہ اس وقت لیٹی ہوئی تھی املی کھا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میری آنکھوں نے اس کے تمام جسم کا جائزہ لیا۔

"کیسی ہو" میں نے پوچھا

"ٹھیک ہوں"

وہ سامنے دیوار کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"مٹھائی کب تک کھلاؤ گی۔

"کیسی مٹھائی"

"ابھی سے بھول گئی ہو۔ ایسے وقت ہیں بھی یاد نہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ بہت وہ ہیں"

"وہ کون"

"نہیں بتاتی"

"تمہیں بتانا ہی ہوگا"

میں نے اس کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے کہا

"اب تو کچھ دن آرام کرلو۔

"میرے بس کا روگ نہیں"

"تمہیں تو سارا دن یہی سوجھتا ہے۔ ذرا باہر سیر کے لئے جاؤ۔ تاکہ کچھ اور بھی سوچ سکو۔ چاہو تو کار لے جاؤ۔

جلد ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ۔ تاکہ پھر باہر جانے کی نوبت نہ آئے"

میں مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ کار نکال کر یونہی بے خیالی میں گلنار کے ہوسٹل کی جانب چلنے لگا۔ میری آنکھوں میں گلنار اور ثمینہ کا چہرہ ایک ایک کرکے گھوم رہا تھا۔ گلنار سے کیا کہوں گا.......

"میں باہر چلا گیا تھا۔ یہ بہانہ بہتر رہے گا۔

جب میں ہوسٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ گلنار کالج چھوڑ کر چلی گئی ہے میرے لئے یہ وقت کتنا صبر آزما تھا۔ میرے تمام منصوبے ختم ہوتے نظر آئے۔ میں اپنے کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا

تھا۔ جیسے میں بہت سے بوجھ تلے دبا جا رہا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ میرے دل و دماغ کو ہوس کی آگ نے گھیر رکھا تھا۔ اور وہ خوفناک حد تک پہنچ چکی تھی۔ مجھے اپنی حالت کسی پاگل سے کم معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ ہوس وفا کے نام سے واقف نہیں۔ ہوس کا جذبہ ایک آگ ہوتا ہے۔ طوفان ہوتا ہے۔ جو ہر اس بند کو جو اس کے راستے میں آجائے توڑ دیتا ہے۔ اور پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑا دیتا ہے پھر اپنی آگ میں خود ہی جل بجھتا ہے، یہی حالت میری تھی — میں ثمینہ کو چھوڑ کر گلنار کے ساتھ اپنی ہوس مٹانے کا ارادہ کرکے وہاں گیا تھا۔ لیکن اس کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ آگ طوفان بن چکی تھی۔ دماغ بالکل خالی تھا۔ اور بری طرح طوفان میں گھرا ہوا تھا۔ کار میرے کنٹرول سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے خود کو قابو میں کرنے کے لئے کار ایک طرف روک دی اور پھر سٹیئرنگ وہیل پر سر رکھ کر سونے کے انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔

"ثمینہ ہی سہی"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور میرا پاؤں کار کے سٹارٹر پر پڑا۔ گھرڑ گھرڑ کی آواز پیدا ہوئی — اور پھر اس کا بھرا بھرا جسم میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، میں نے چند ماہ پہلے کی ثمینہ کو دماغ میں بسانے کی کوشش کی۔ لیکن میری آنکھیں دھوکا نہ کھا سکیں۔ میں بہت زیادہ پریشان ہو چکا تھا۔ میں نے کار کو گھمایا۔ اور پھر شراب خانے کے سامنے روک کر اندر چلا گیا۔ اور ایک خالی میز دیکھ کر بیٹھ گیا۔

میزوں پر لوگ بیٹھے ہوئے دل بہلانے میں مصروف تھے۔ ایک میز پر ایک شخص پی کر میز پر سر رکھے بیٹھا ہوا تھا، بوتل میز پر گری پڑی تھی

اور شراب بہہ کر نیچے گر رہی تھی۔ اور وہ اپنے منہ کے قریب سے گرنے والی شراب کو زبان سے چاٹ رہا تھا۔

دوسری میز پر تین آدمی آپس میں ایک آخری پیگ پر جھگڑ رہے تھے اور ہر کوئی اسے پینے پر اصرار کر رہا تھا۔ پھر تینوں آپس میں الجھ پڑے۔ اور وہ آخری پیگ بھی گر کر ضائع ہو گیا.... وہ ایک دوسرے کو گالیاں دینے لگے۔ اور منیجر کے حکم سے انہیں بیروں نے باہر نکال دیا۔

تیسری میز پر ایک صاحب غالب کے غلط اشعار پڑھ کر شراب سے دل بہلا رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے اپنی باقی ماندہ شراب کو اپنے سر میں الٹ لیا۔ بالوں سے ٹپکتے ہوئے شرابی قطروں کو زبان سے چاٹنے لگا۔ اور پھر مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر چیخا۔

"میرے خیال سے آپ کو بھی شعر و شاعری سے دلچسپی ضرور ہے۔ آپ کو غالب کا کوئی شعر یاد ہے۔ بس کیا غالب ہی شاعر تھا۔ زندہ باد چچا غالب۔ اگر تم زندہ ہوتے تو تمہیں اس شراب کی سب سے گھٹیا شراب پلاتا۔ اور تمہارے اچھے اچھے شعر سنتا واہ۔ واہ صاحب واہ واہ"

پھر وہ صاحب رونے کے انداز میں چیخنے لگے۔

میں نے بیرے کو وسکی لانے کے لئے کہا۔ میں نے دو پیگ مشکل سے پئے ہوں گے۔ کہ میرے دل میں پھر سے آگ بھڑک اٹھی۔ میں نے پینا بند کر دیا اور بوتل لئے ہوئے کار میں جا بیٹھا۔ مجھے اپنے تعاقب میں اسی بگڑے شاعر کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔

"میاں غالب کا شعر تو سنتے جاؤ.... سنو تو سہی"

میں نے جلدی کو کار سٹارٹ کی۔ اور بلا وجہ ایک سمت کو چل پڑا۔ اور مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا۔ جہاں کہیں کوئی جوان عورت یا لڑکی نظر آتی میں کار آہستہ کر کے اسے دیکھتا ہوا گزر جاتا تھا۔

میں نہ جانے کب تک یونہی کار گھماتا رہا۔ مختلف سڑکوں پر مختلف جگہوں پر۔ لیکن مجھے سکون نہ ہوا۔ پھر اچانک میرا پاؤں بریک پر پڑا۔ اور کار ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ میرے قریب ہی ایک لڑکی حیرانگی سے بھٹی بھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کار کو آہستہ سے ایک کنارے پر روکا۔ اور لڑکی کو قریب بلایا۔ وہ ایک خاص انداز سے چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ اس کے کٹے ہوئے بال بڑی ترتیب سے سجے ہوئے۔ چہرے پر ہلکے پوڈر کی تہہ تھی۔ اور اس میں ملی جلی سرخی نے اور بھی غضب ڈھا رکھا تھا۔ قمیض سے اس کے جسم کے تناسب پھولے پڑ رہے تھے۔ اور ابھار کسی اچھے مصور کے خطوط کی مانند نمایاں تھے۔ اور وہ میرے قریب آ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"کیسی ہو ڈوبنی"

میں نے اس کے جسم کا جائزہ لے کر پوچھا۔ میرے ہونٹ خشک سے ہو چکے تھے۔ اور آواز گلے میں پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔